اے عشقِ بلا خیز
خالد فتح محمد

اے عشقِ بلاخیز

خالد فتح محمد
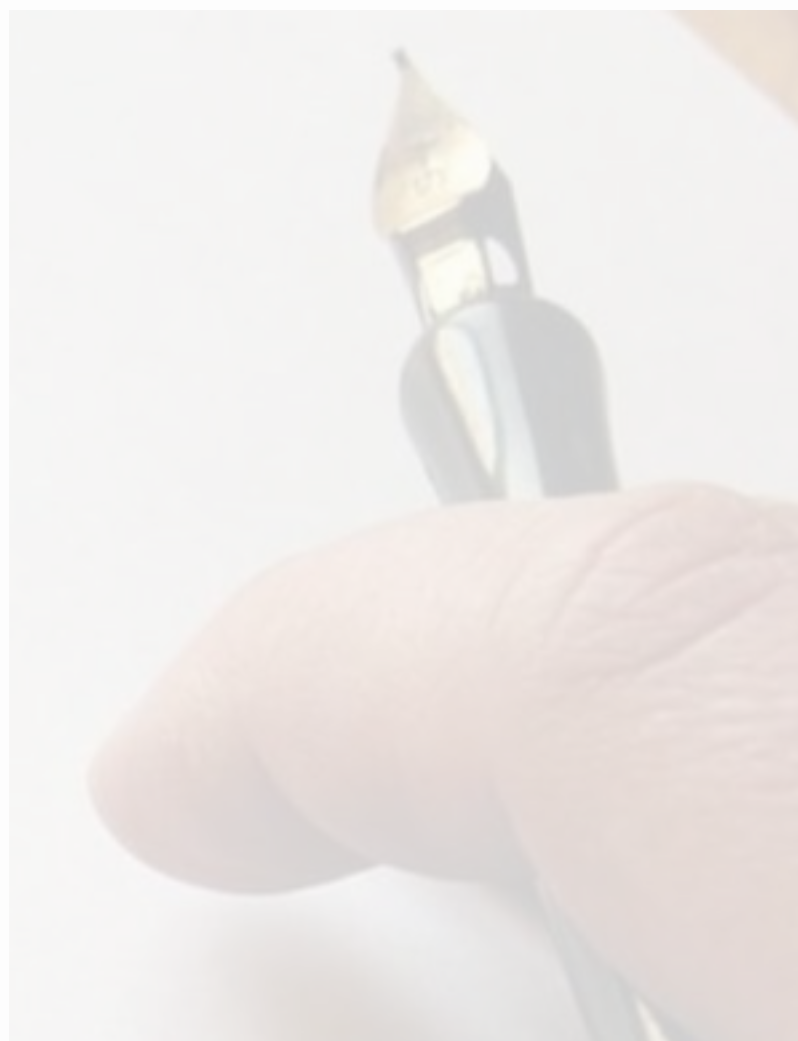
جُمہوری پبلیکیشنز

طارق کے نام

لوگوں کو ہے خُرشیدِ جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ اے عشق بلاخیز	• مصنف۔ خالد فتح محمد
• اشاعت۔ 2017ء	• سرورق۔ مصباح سرفراز
• ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور	• جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-652-097-9

قیمت 500 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140, +92-42-36283098

Info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

میں اُس کے جنازے میں شامل ہونے کے باوجود شامل نہیں تھا!

وہ ایک سلگتی ہوئی سہ پہر تھی جب ذہن میں سوال اُٹھتے ہیں لیکن اُن کے جواب سوچنے کے لیے واقعات بیچ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ یہ پرندوں کے آرام کرنے کا وقت ہوتا ہے جب وہ شام ہونے سے پہلے اپنی آرام گاہوں سے نکل کر لمبی رات کے آغاز تک خوراک حاصل کرنے کے لیے دِن میں دوسری مرتبہ نکل پڑتے ہیں۔ اُس سہ پہر وہ اپنے عارضی ٹھکانوں میں بے چین تھے۔ اُس سہ پہر سورج میں شدت نہیں تھی گرچہ اُن دِنوں میں رات میں ایک ناشناسا سی ٹھنڈ آ جاتی ہے لیکن دِن میں دھوپ کسی طور مزاج میں آسودگی کا پہلو داخل نہیں ہونے دیتی؟ اُس سہ پہر ایک بے نام سی خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ قبروں کی قطاریں کسی بوجھ تلے دبی محسوس ہوا کرتی تھیں لیکن اُس سہ پہر احساس ہوا کہ مردے وہاں سے سر اُٹھا کے نئی قبر کی طرف جھانک رہے ہیں۔

میں نے بھی اُس قبر کی طرف دیکھا!

لوگ قطاروں میں کھڑے تھے اور ایک آدمی قطاریں گن رہا تھا۔ اُس نے کچھ کہا اور آخری قطار میں سے لوگ نکل کر دوسری قطاروں میں شامل ہو گئے۔ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہاں کسی مجمع کا احساس ہو لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ محسوس ہو کہ وہ اکیلی ہے۔ ویسے وہ ساری زندگی اکیلی رہی تھی؛ اُسے اکیلے رہنا ہی پسند تھا۔ وہ ایک مجمع میں اکیلی ہوتی تھی، یہاں جب اُسے دفن کیا جا رہا تھا تو اُس کے اکیلے ہونے کا احساس مجھے کھائے جا رہا تھا۔ کیا وہ رات یہاں اکیلی ہی رہے گی؟ میں ایک طرف کھڑا کسی کو نظر آئے بغیر سب دیکھ رہا تھا!

میں نے دیکھا کہ امام نے تکبیر پڑھی اور قطاروں میں ہر طرح کی حرکت ختم ہوگئی۔ نمازِ جنازہ پڑھی جانے لگی اور میں لوگوں کے انہماک سے متاثر ہوکر اُنھیں توجہ سے دیکھنے لگا۔ امام نے سلام پھیرا صفیں بے ترتیب ہوگئیں اور کچھ بیٹھ گئے اور کچھ لوگ کھڑے رہے۔ امام نے دعا مانگنا شروع کردی۔ مجھے اُس کی آواز تو نہیں آرہی تھی لیکن میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ امام نے دعا ختم کی تو سب ایک قطار بنانے میں مصروف ہوگئے تاکہ اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے آخری دیدار کرسکیں۔ مجھے کسی نے اندر سے اُکسایا کہ میں بھی اُس کا آخری دیدار کرلوں۔ میں اُس کو اپنے ذہن کی آنکھ میں ہر وقت زندہ رکھنا چاہتا تھا!

لوگ اُس کے پاس سے گزرتے رہے یہاں تک کہ اُس کے باپ نے بھی آخری مرتبہ اُسے دیکھ لیا۔ وہ اُس کے پاس ایک لمحہ رکا، اُس نے ایک لمبی سانس لی اور پھر اُس نے چاروں طرف دیکھا اور ہماری نظر ملی۔ اُس نے پھر ایک لمبی سانس لی، میں جانتا تھا کہ اُس کے ہونٹوں کے کنارے کپکپا ئیں ہوں گے، اُسے محسوس ہوا ہوگا کہ اُس کے ہونٹوں کے کناروں پر تھوک جم گیا ہے، وہ اُنھیں اپنے ہاتھ یا زبان سے صاف کررہا ہوگا۔

اُس کی میت کو اُٹھا کر قبر کے پاس رکھ دیا گیا۔ کیا یہ آخری سم تھا ؟ کیا کینوس پر ٹنگی ہوئی تصویر پر آخری برش لگا دیا گیا تھا؟ جلد ہی اُسے مٹی کے نیچے دبا دیا جائے گا اور ہم دونوں کے درمیان میں موت ایک حقیقت کی طرح ٹنگی رہے گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت پانی کی طرح ہوتی ہے جو کبھی ٹوٹتا نہیں۔ میں نے یہ اُسے بتایا نہیں تھا۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ پانی جب برف بنتا ہے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ موت کی برف نے اُس کی محبت کے پانی کو توڑ دیا۔

وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی! جب تک اُس کی میت سامنے رکھی تھی، میرا اُس پر حق تھا اور اُس کے دفنائے جانے کے بعد میں اُسے کسی اور کے سپرد کررہا تھا جب کہ اُس نے اپنی زندگی میرے اوپر قربان کردی تھی۔ مجھے "اے فیئر ویل ٹو آرمز" کی کیتھرائن یاد آ گئی۔ وہ مرگئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ زندہ تھی کہ میں نے اُسے یاد رکھا ہوا تھا۔ شاہ جہاں نے ممتاز محل کے لیے تاج محل اِس لیے بنوایا کہ جب اُس کا ذکر آئے تو تاج محل کو بھی یاد کیا جائے یا جب تاج محل کی بات ہو تو اُس کے خالق کی تعریف کی جائے۔ ممتاز محل تو ایک ذریعہ تھی! مونا لیزا کے خالق نے وہ تصویر کس کے لیے بنائی تھی؟ اپنے لیے یا

مونالیزا کے لیے ؟میں بادشاہ نہیں تھا کہ تاج محل بنا دیتا! میں تو زندگی کی جدوجہد میں یقین رکھنے والا ایک عام آدمی تھا۔ میری پشت پر نا تو دہلی کی سلطنت تھی اور نا ہی ارنسٹ ہیمنگوے کی طرح الفاظ کا خزانہ۔ مجھے اپنے آپ کو نہیں، اُسے زندہ رکھنا تھا یا اُسے زندہ رکھنے کے بہانے اپنے آپ کو امر بنانا تھا!

اُسے قبر میں اُتارا جانے لگا۔ اُس کا باپ اور بھائی ایک طرف کھڑے یہ عمل دیکھ رہے تھے۔ کسی نے اُنھیں اِس عمل کا حصہ بننے کا کہا نہیں تھا یا وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے زیرِ زمین کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صرف ایک آدمی اِس عمل میں پیش پیش تھا اور وہ، وہ تھا جس کے ساتھ اُس کی منگنی ہوئی تھی۔ مجھے ''گون وِد دی ونڈ'' کا ایشلے یاد آ گیا۔ نوید کو اپنے منگیتر کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ سکارلٹ او ہارا نے تو ایشلے کو پسند کیا تھا اور ریہٹ بٹلر نے سکارلٹ او ہارا کو۔

مجھے اُس سے محبت تھی!
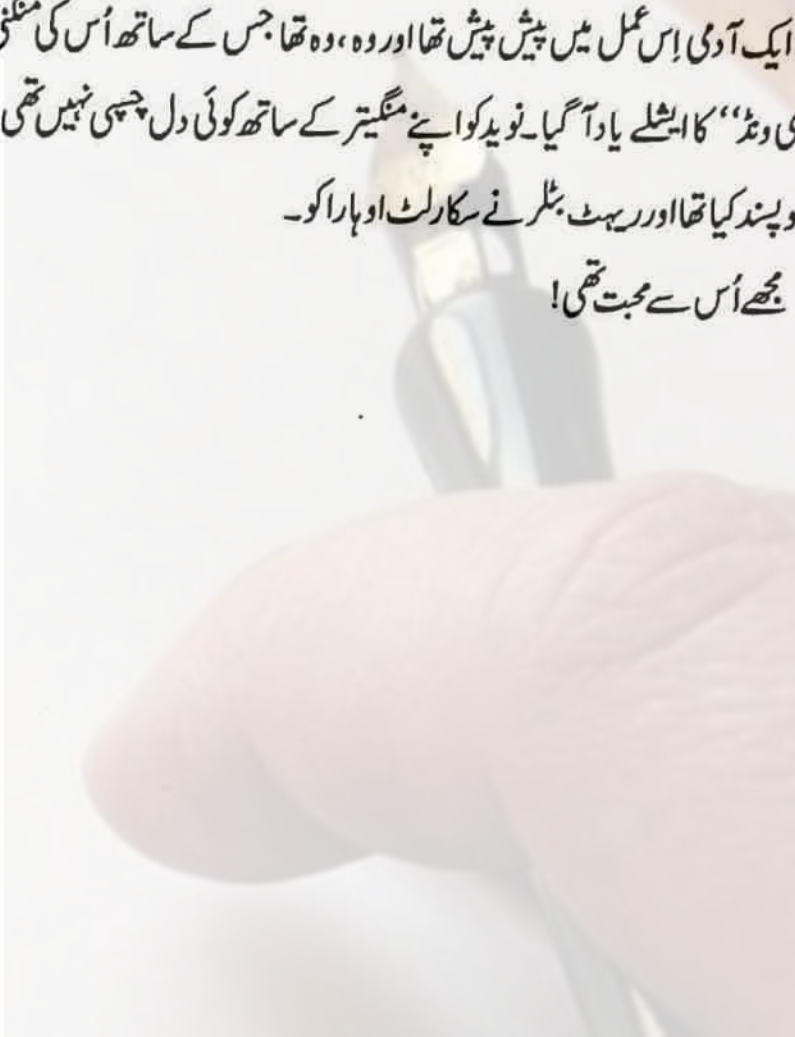
نوید کا گھر ایک ''کل ڈی سیک''میں تھا۔ اُس گلی میں دراصل دو گھر تھے اور جو تقریباً ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہم ایک گھر میں کرائے دار تھے اور ہر کرائے دار کی طرح بے وقعت!

میرے شہر کی تاریخ چندر گپت موریہ کے دورِ سلطنت سے شروع ہوتی ہے، مورخ اِس بارے میں کسی تفصیل میں تو نہیں جاتے لیکن یہ طے ہے کہ اُس وقت یہاں ایک آبادی تھی جس کا نام کوئی اور تھا۔ اُس وقت لاہور کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ میرے شہر نے سکھوں کا عروج اور زوال دیکھا اور اُن کے عروج کے دنوں میں اِسے بھی عروج ملا۔ اِس شہر کی گلیاں ہموار اور کھلی ہوتی تھیں، لوگ ایسی زندگی بسر کرتے تھے جس کا تصور کرنا بھی مبالغہ ہوگا۔ تب عمارتیں اپنے ہی غرور سے تنی ہوئی تھیں اور پرانے شہر کو ترک کرنا بیوفائی تصور کیا جاتا تھا۔ زندگی اپنی خودغرضی کو لپیٹے بے غرض سی راہ پر رواں تھی۔ لوگ اپنی زندگیاں کرتے ہوئے دوسروں کی زندگیاں بھی جیتے تھے اور ایک محبت تھی جو سب کو ڈھیلی سی مگر مضبوط رسی کے ساتھ باندھے ہوئے تھی۔ زندگی تو وقت کی طرح ایک چکر کے ساتھ بندھی ہوتی ہے جو گھومتے ہی چلے جاتا ہے۔ اُس بے غرض سی راہ پر، جس پر زندگی رواں تھی، غرض نے اپنے اڈے بنانا شروع کر دیے جن پر زندگی کرنے والے رکنے لگے اور وہ بے غرضی جو سب کا دھرم تھا اب اُنھیں اپنی ترقی میں رکاوٹ لگنے لگی۔ اِسی ترقی کے حصول کے لیے خودغرضی ہی اُن کو واحد ذریعہ میسر تھا اور بے غرضی اُن کے ہاتھ سے پھسلنا شروع ہوگئی۔ جب میں نے زندگی کا سفر شروع کیا تو خودغرضی عروج پر تھی اور میں اُس ''کل ڈی سیک''میں رہتا تھا جہاں مجھے نہیں رہنا چاہیے تھا اور اگر وہاں نہ رہا ہوتا تو پھر کہاں رہتا؟

میرے گھر کے سامنے اُس کا دومنزلہ گھر تھا۔ مجھے اتنا پتا تھا کہ میرے ہمسایوں کی ایک لڑکی

ہے جو روزانہ تانگے میں سکول یا کالج جاتی ہے۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُن دنوں میں ایک ایسی اخلاقی پابندی ہوا کرتی تھی جسے توڑنا غیر اخلاقی عمل سمجھا جاتا تھا پھر بھی میری کوشش رہی کہ میں اُسے دیکھ سکوں۔ وہ دو اور لڑکیوں کے ساتھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر، جہاں ایک چادر تنبو کی طرح تنی ہوتی، بیٹھتی اور اُسے وہاں دیکھنا اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا گھر کے اندر۔ میں نے ایک دن بائیسکل پر اُس کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیل تک پہنچنے تک تانگے کے پیچھے تین اور بائیسکل سوار بھی تھے جو ہر طرح سے فلمی میک اپ میں تھے۔ اُنھوں نے اپنی قمیصوں کے کالر اُٹھائے ہوئے تھے، ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ لہرا رہی تھی اور کھلے بٹنوں کے اندر سے بغیر بالوں کے چھاتیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں تو منہ ہاتھ دھوئے بغیر ہی نکل آیا تھا۔ میرا مقصد اُسے متاثر یا متوجہ کرنے کے بجائے ایک نظر دیکھنا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تینوں بائیسکل سوار اُن تین لڑکیوں کے پیچھے ہیں؛ ہر لڑکی کا ایک عاشق تھا یا تانگے میں بیٹھی ہر لڑکی اُن تینوں میں سے کسی ایک کی محبوبہ تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم سی بھی محسوس ہوئی؛ مجھے اپنا یہ عمل نہایت بھونڈی حرکت لگی۔ اُن تینوں میں ایک میرا رقیب بھی تھا جو اُس وقت دیکھنے میں مجھ سے یقیناً بہتر تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ اب، کبھی ایسا تعاقب کرنے کے بجائے، اُسے گھر سے نکلتے ہی دیکھوں گا۔

اُس کے گھر کو اِس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اُن کے باہری دروازے سے جب کوئی نکلے تو ہمارے دروازے سے نظر نہیں آتا تھا اور اُسے دیکھنے یا ملنے کے لیے گلی کے باہر کھڑا ہونا پڑتا۔ وہاں کھڑے ہونے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن ایسے وقت میں کھڑے ہونے میں تھی جب لڑکیوں کو لیے وہ تنبو نما تانگہ وہاں موجود ہوتا۔ میں بھی اُسے دیکھنے یا شناسائی کرنے کے لیے وہاں کھڑا ہوتا تھا لیکن جب وہ گھر سے نکلتی تو کوئی اخلاقی قدر اتنی وزنی تھی کہ مجھے اُس طرف دھکیل دیتی جہاں سے میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے انداز میں چلتے ہوئے ہوئے تانگے میں سوار ہو کے چلی جاتی۔

ہم چند سالوں سے اِس گھر میں رہ رہے تھے۔ یہ گھر متروکہ جائداد تھی اور ابا اِس کا کرایہ باقاعدگی کے ساتھ محکمہ اوقاف کے کسی اکاؤنٹ میں جمع کروا رہے تھے اور ساتھ مسلسل اِس کوشش میں بھی تھے کہ گھر اُنھیں الاٹ ہو جائے۔ اِس سوچ کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے تین وکیلوں کے ایک پینل کو اپنی نمائندگی کے لیے مقرر کیا ہوا تھا اور خاندان کے محدود ذرائع میں سے ہر ماہ اُنھیں فیس دیتے جو اماں جان کو قطعاً قبول نہیں تھا؛

''بھاڑ میں گئی تمھاری سوچ! ہم نے گھر کو پھونکنا ہے اگر ہم اپنے خرچے ہی پورا نا کر سکیں۔''

میرے خیال میں یہ فقرہ اُن کے درمیان میں موجود ذہنی خلیج کو ثابت کرنے لیے کافی تھا۔

''مراد آباد سے اِس طرح بے گھر زندگی گزارنے نہیں آئے۔ یہ گھر کسی کو تو ملنا ہے اور بھلی مانس اگر ہم اِس کے مالک بن جائیں تو کیا حرج ہے۔'' ابا دل چسپی میں چھپی اُکتاہٹ سے جواب دیتے۔ اماں جان چولھے کے پاس سے اُٹھ کر کولہوں پر ہاتھ رکھ کر جارحیت بھرے انداز میں ابا کے سامنے کھڑی ہو جاتیں:

''کھانے پینے کے خرچے اور بچوں کی تعلیم کا بوجھ کیا کم تھا کہ وکیلوں کی تنخواہیں بھی ہم پر لادی گئیں ہیں۔ اگر گھر نا ملا تو؟'' یہ وہ سوال تھا جسے سن کر ابا بھی کسی حد تک پریشان ہو جاتے اور جیب میں ہمیشہ رکھی چھالیا کے دو دانوں میں اپنی پناہ ڈھونڈتے۔

''پنجابی ہر جائداد پر قبضہ کیے جائیں؟ ہم بھی اِس ملک پر کچھ حق رکھتے ہیں۔ اب واپس جانے سے رہے، اگر اتنے تونگر ہوتے تو آتے ہی کیوں؟'' ابا روز کا رٹا ہوا خطبہ سنا ڈالتے۔ مجھے کسی دن اُن کے خطبے میں اعتماد کی کمی بھی محسوس ہوتی۔ ہمارے گھر میں ہر وقت ایسے اختلافات چلتے رہتے جن کا حل ابا کے سوا کسی کے پاس نہیں تھا اور جنھیں، اُنھیں حل کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ہمارا گھر بھی دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل میں صحن تھا جہاں سب لوگ شام کو بیٹھتے۔ ابا کو یہ پنجابی طریقہ قطعاً پسند نہیں تھا۔

''میاں! سفید چادریں بچھی ہوں، دستر خوان سجا ہو، بہاری کھانے لگے ہوں اور ہم بہار والوں کی طرح کھا رہے ہوں۔'' ابا کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوتی۔ ''ہم شامیں چارپائیوں پر بیٹھے گزارا کریں گے، مقامیوں کی طرح اور ہمارا اپنا تمدن اکثریت کی نظر ہو جائے گا۔'' ابا مایوسی سے کہتے، ''تم لوگ تو گھر میں تہہ بند باندھنا چاہتے ہو۔'' وہ ہم بھائیوں کو ایک طرح سے الزام دے رہے ہوتے۔ میں نے تو کبھی کبھی تہہ بند باندھنا شروع کر دیا تھا جو میرے والد کو پسند نہیں تھا۔ میں اپنے کاموں سے فارغ ہو کے شام کو تہہ بند باندھ لیتا اور دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل جاتا۔ تہہ بند مجھے ایک آرام دہ پہناوا لگتا اور میرے والد کے مطابق اِس سے بیہودہ لباس کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا!

میں نے تہہ بند کسا ہوتا، پاؤں میں ہوائی چپل اور ایک میلی سی قمیص جسے گھر سے نکلتے ہی اُتار کر کندھے پر رکھ لیتا؛ مجھے اِس طرح اپنے دوستوں کے ساتھ پھرنا اچھا لگتا تھا: ایسے محسوس ہوتا کہ میں

اِس تہذیب کا حصہ ہوں۔ ابا کا اپنا تہذیبی ورثہ جسے وہ مراد آباد میں چھوڑ آئے تھے، مجھے اُس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ کسی وقت اُن کا حصہ ضرور رہا ہوگا مگر اب نہیں تھا۔ میں محسوس کرتا کہ اب اُنھیں مقامی رسوم کو بھی قبول کر لینا چاہیے کہ اِن میں ایک کھردری سی رومانیت تھی جسے سمجھنے کے لیے ان لوگوں کا حصہ ہونا ضروری تھا۔

''ابا!'' ایک دن میں نے اُن کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ظاہر کیا کہ باہر جانے لگا ہوں، تہہ بند باندھ کر میں صحن میں آ گیا۔ ابا موڑھے پر بیٹھے تھے اور ساتھ پڑی چھوٹی میز پر اُن کی سپاریوں کی گتھلی رکھی تھی۔ اماں جان باورچی خانے میں تھیں جو صحن کے ایک کونے میں تھا، اُس کے ساتھ ہینڈ پمپ تھا جس کے کھرے میں ماسی برتن اور کپڑے دھوتی۔ ہم کبھی کبھار ہتھی چلا کر منہ پر چھینٹے مار لیتے ورنہ ہمیں اُسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسرے کونے میں ٹٹیاں تھیں جن کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا جہاں سے مہترانی صفائی کے لیے داخل ہو جاتی۔ دوسرے دونوں کونوں میں تین کمرے تھے جن کو ابا، اماں جان اور میرے دونوں بھائی سنبھالے ہوئے تھے اور میں از خود اوپر والی منزل میں اکیلا رہتا تھا جہاں کبھی کبھار آنے والا کوئی مہمان بھی ٹھہر جاتا۔

''ابا!'' میں نے دہرایا تا کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ لیں۔ وہ ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہوتے جس کے ایک طرف بیٹھک اور دوسری طرف غسل خانہ تھا جو ٹٹیوں میں بھی کھلتا۔ ''آپ مقامی لباس پہننا شروع کریں۔ اماں جان تو ساڑھی ترک کر کے شلوار قمیص پہننے لگی ہیں۔ آپ کبھی کبھار تہہ بند میں سج جایا کریں۔'' میں نے متوقع ناراضی سے بچنے کے لیے مذاق کا سہارا لیا۔

اُن کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ میں اُن کے طنز کی یلغار کا منتظر ہو گیا۔ ''اور اگر یہ سالی نیچے کھسک گئی تو اِسے اُٹھائے گا کون؟ میں تو نہیں جھکوں گا!'' اور پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے، ''میاں! یہ ہمارا لباس نہیں۔ ہم تو وہی پہنیں گے جو صدیوں سے پہنتے چلے آئے ہیں۔ مجھے تو تمھارا یہ رام لیلا کھیلنا پسند نہیں۔'' اُن کی آواز میں دکھ اور تھکاوٹ تھے۔ مجھے تھکاوٹ میں شکست نظر آئی جس سے میں پریشان بھی ہوا اور اُن کے سامنے رکھے موڑھے پر بیٹھ گیا۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے ؟'' اُنھوں نے اُسی لہجے میں پوچھا۔ میں ذرا ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا۔ کئی دنوں سے میں نے گھر آ کے دہرائی یا کسی سبق کو ایک نظر دیکھنے کے لیے کوئی کتاب چھوئی تک نہیں

تھی۔ ابا اکثر اِسی طرح، لاتعلق سے ہو کر، گفتگو کو میری پڑھائی کی طرف موڑ کے ایسے سوال اُٹھانا شروع کر دیتے جن سے وہ معلوم کر لیتے کہ میں پڑھائی میں اتنی دل چسپی نہیں لے رہا جتنی لینی چاہیے۔ وہ اپنی گفتگو کا اختتام ایسے کرتے جو میرے لیے شرمندگی کا باعث ہوتا: ''تمھاری پڑھائی کی طرف توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ میں تمھیں جلد از جلد قانون کی ڈگری حاصل کرانا چاہتا ہوں تا کہ تم گھر کا بوجھ سنبھال سکو۔'' وہ کہتے تو درست تھے، میں کسی جماعت میں لڑھکے بغیر اپنی پڑھائی مکمل بھی کرنا چاہتا تھا لیکن یکسوئی سے محنت کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں کئی ہفتوں بعد کسی شام بیٹھ کر جو پڑھایا گیا تھا ایک نظر دیکھ لیتا۔ میں گھر میں جب ہوتا تو بالکونی میں آرام کرسی پر بیٹھا سامنے والوں کی بالکونی سے ہوتی اور پر چھت کی طرف چلی جاتی سہرا بیل میں سے آتی جاتی چڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ بیل اتنی گھنی تھی کہ اُس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔
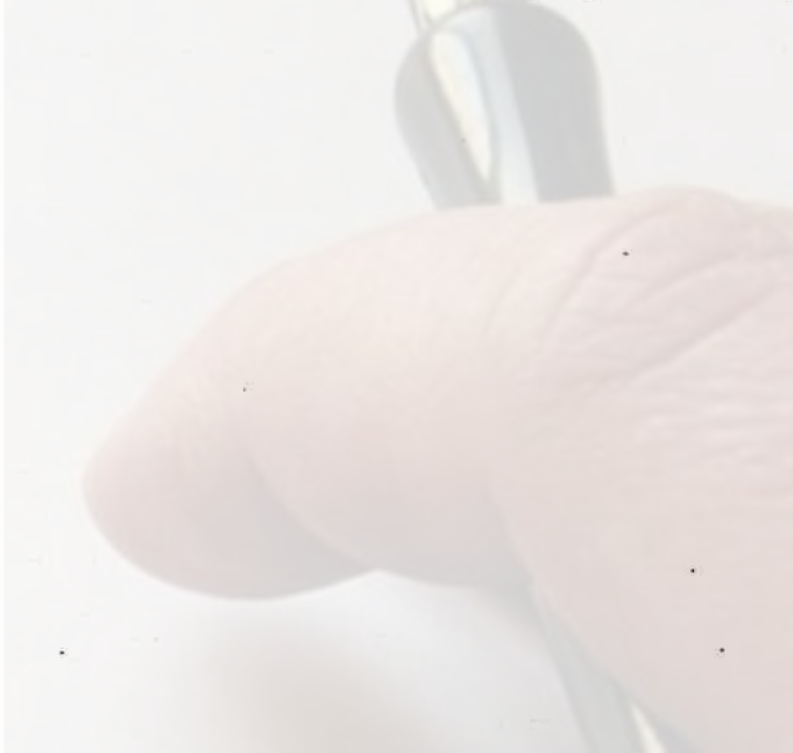
اُس دن دو اہم واقعات ہوئے!

آسمان پر بادل کی ٹکڑیاں معلق سی ہوگئی تھیں۔ سردی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی اتنی ٹھنڈ نہیں تھی کہ ہم سرما کے پہناووں میں آ جاتے، بس ایک مدھری حدت تھی جو جسم کو سائے میں رکنے سے روکتی تھی اور کالج میں درختوں کے نیچے سے لڑکوں کے ہجوم روشوں پر منتقل ہونا شروع ہو گئے؛ ایک گہما گہمی کا احساس رہتا۔ لڑکے درختوں کے سائے میں بیٹھے گپ لگانے کے بجائے روشوں پر چہل قدمی کرنے لگ گئے تھے۔ کلاسوں میں حاضری بڑھ گئی تھی کہ وہاں اب گرمی کی وجہ سے گھٹن نہیں ہوتی تھی۔ میرا کالج میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا جس کے ساتھ میں اپنے فالتو پیریڈوں میں بیٹھ سکتا۔ میں کینٹین یا کسی کونے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا اور موڈ ہوتا تو کلاس میں چلا جاتا۔ میں کینٹین میں بیٹھا پیریڈ کے ختم ہونے یا نئے کے شروع ہونے کے انتظار میں بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھا تھا کہ وہاں مستقل بیٹھنے والے چند ہم جماعت اُٹھ کر تعلیمی بلاک کی طرف چل پڑے اور میں بھی اُن کے پیچھے ہولیا۔ اگلی کلاس انگریزی کی تھی جو ملک جمیل پڑھاتے تھے۔ میں بے نیازی سے اپنی کاپی پکڑے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوا تو پچھلے بنچوں پر بیٹھنے والے ابھی تک بیٹھنے کی جگہ طے نہیں کر پائے تھے کہ ملک صاحب داخل ہو گئے۔ میں درمیان والی قطار کے آخری بنچ پر بیٹھ گیا جہاں دو لوگ اور بیٹھے تھے۔ جمیل صاحب کسی نظم کی تشریح میں لفظ Lethargy کے معنی سمجھاتے ہوئے تین یا چار قدم آگے بڑھے اور ہمارے پاس رُک گئے۔ اُنھوں نے گردن تک پھیلے اپنے وسیع ماتھے پر سے رومال کے ساتھ پسینہ پونچھتے ہوئے ہم تینوں کو غور سے دیکھا اور بولے: ''یہ ایشیائی لوگوں کی Lethargy کی ایک مثال ہے۔ کھڑے ہو جاؤ۔'' اُنھوں نے ہم تینوں کو

اشارہ کیا۔ ''یہ تینوں گھر سے پڑھنے آئے ہیں اور کسی کے پاس کتاب نہیں۔'' اِس سے زیادہ بے عزتی ممکن نہیں تھی لیکن ایک طالبِ علم جتنا بے بس کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس پر کئی دباؤ ہوتے ہیں جنھیں وہ بہت کم عمری میں برداشت کرنا سیکھ جاتا ہے؛ والدین کا دباؤ، ادارے کا دباؤ اور معاشرے کا دباؤ! میں کچھ کہنا چاہنے کے باوجود کچھ نا کہہ سکا۔ ''بیٹھو!'' اُنھوں نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ میں کھسیانہ سا بیٹھ گیا۔ میں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کو کینٹین میں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ متناسب جسم کا اُٹھتے ہوئے قد کا مجھ سے عمر میں قدرے چھوٹا نوجوان تھا۔ اُس کے تھوڑے سے موٹے ہونٹ پر مونچھوں کی باریک سی لکیر نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ لمبا، ٹھوڑی چوڑی اور رنگ سرخی مائل سفید تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنائیت سے مسکرایا جب کہ میں اپنی شرم ساری پر قابو پانے کی سعی میں تھا۔ پیریڈ کے اختتام پر اُس نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا:

''میرا نام شبّر ہے۔'' اُس نے کالر کے ہڈی والے سوراخ میں سے سگریٹ نکال کے مجھے دیا، ''لمبا کش نہیں۔'' اور ہم اپنا اپنا کش لگانے کے بعد اگلے کش کے انتظار میں کینٹین کی طرف چل پڑے۔

سید شبر حسین زیدی کے ساتھ میری دوستی کا یہ آغاز تھا۔

دوسرا واقعہ کالج سے واپسی پر ہوا۔ کشمیر محل سینما کا ریلوے پھاٹک بند تھا جس کے کھلنے کے انتظار میں تانگوں کی لمبی قطار کھڑی تھی۔ اِس قطار میں تنبو والا تانگہ بھی شامل تھا۔ میں ایک بے چین سی کیفیت میں تانگے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے وہاں ایک طرح کی تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا، تانگے کے تنبو کی دراز میں صرف دو سر نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ ایک لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ تینوں عاشق تیر کی شکل میں تانگے کے پیچھے کھڑے تھے، دو تانگے کے دونوں اطراف اور ایک درمیان میں تھوڑا پیچھے۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ اِسی فارمیشن میں تانگے کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کے آپس میں کیا اشارے تھے جن سے وہ گفتگو کرتے تھے یا لڑکیوں کے ساتھ کوئی رابطہ تھا یا اِس مستعدی سے تعاقب کرنا اُن کی کسی نفسیاتی محرومی کا حل تھا۔ پہلے میں اُن کی اِس کارگزاری سے متاثر تھا لیکن اُس دِن ریلوے پھاٹک پر کھڑے وہ مجھے کافی بے بس نظر آئے۔ کیا وہ تانگے میں بیٹھی لڑکیوں کو پسند کرتے تھے یا اُن کا مقصد اپنی انا کی تسکین تھی۔ کیا اُنھیں لڑکیوں، اپنی یا تمام فریقوں کے والدین کی عزت کا کوئی

خیال نہیں تھا؟ اور وہ سمجھتے تھے کہ سب دنیا اندھی ہے یا وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے تھے؟

ریلوے پھاٹک کے کھلنے کے انتظار میں کھڑے اِس مضحکہ خیز ڈرامے کے کرداروں کو غور سے دیکھا تو مجھے اُن سب پر ترس آیا۔ بائیسکل سوار نوجوان تو مجھے پیشہ ور اداکار لگے جنھوں نے کہیں نا کہیں یہ کردار نبھانے تھے؛ صرف لڑکیاں ہی اِس غیر حقیقی کھیل میں حقیقی نظر آئیں، لڑکے شاید کسی خواب کے تعاقب میں تھے جو کسی وقت اُن کے ہاتھ سے نکل کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ اُسی وقت تانگے میں حرکت ہوئی، اور اردگرد دل چسپی میں ڈوبی ہوئی کئی لاتعلق آنکھیں اُس طرف دیکھنے لگیں۔ لڑکی اشارہ کیے بغیر ، تھوڑی اکڑ کر بیٹھی، کسی کو اشارہ کر رہی تھی۔ وہ سب شاید ایسے اشاروں کے عادی تھے یا اُنھیں انتظار تھا کہ ایسا کچھ ہو جو وہاں اُس وقت کی تھکا دینے والی یکسانیت میں کسی طرح تبدیلی لے آئے۔ اُسی وقت دور ریل گاڑی کی دھمک سنائی دی۔ تمام لوگ اپنی سواریوں پر چوکس ہو کے بیٹھ گئے۔ لڑکی نے پردے کے کونے کو پہلے ہی سرکا دیا تھا۔ باقی لوگوں نے بھی دیکھا ہو گا لیکن مجھے وہ بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ پہلی نظر میں میرے لیے کہنا کافی ہو گا کہ وہ ایک خوب لڑکی تھی؛ شاید وہ خوب صورت نا رہی ہو اور اُس عمر میں تمام لڑکیاں ہی خوب صورت لگتی ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں ہر طرف صرف خوب صورتی بکھری ہوتی ہے۔ اُس لڑکی نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور مجھے لگا کہ ہر آدمی یہ سمجھا تھا کہ اشارہ اُس کی طرف تھا۔ ہر چہرہ مسکراہٹ سے کھل اُٹھا۔ اُن خوش فہموں میں، مَیں بھی شامل تھا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوش قسمت میں ہی تھا۔ میں بائیسکل کو پیروں سے دھکیلتے ہوئے تانگے کے پاس گیا تو اُس نے کمال دلیری کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جس میں ایک رقعہ تھا۔ میں نے ایک عجیب طرح کی بے بسی، خوف، مسرت اور فخر کے ساتھ چاروں طرف دیکھا تو بائیسکلوں والا تیر ٹوٹ چکا تھا اور وہ اپنی جگہیں چھوڑ چکے تھے۔ مجھے اپنے بدن میں خوف کی کپکپی محسوس ہوئی اور اپنا اعتماد ظاہر کرنے کے لیے میں نے کسی طرف دیکھے بغیر بے اعتنائی کے ساتھ رقعہ جیب میں ڈال لیا۔ مجھے اپنے اردگرد ہر چیز ایک تجسس میں ڈوبی نظر آئی لیکن میں نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھا اور کامیابی کے مخفی جذبے میں سرشار گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں کئی وسوسے مجھے گھیرے رہے؛ کیا مجھے بیوقوف تو نہیں بنایا گیا تھا؟ میں ایک غیر اہم سا طالب علم تھا جو بس جوں توں کر کے اپنی تعلیم ختم کرنے کے مشکل مراحل سے گزر رہا تھا۔ میرا کسی

کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا اور نا ہی مجھے اِن لڑکیوں میں کوئی دل چسپی تھی، میں تو صرف اپنی گلی کی لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا اور میں نے اپنی اِس خواہش کو کسی پر آشکار بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم میَں گھر پہنچا تو ایک عجیب طرح کی تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ ابا ایسی تھکاوٹ کو اعصابی بوجھل پن کہا کرتے تھے اور میں اِس اصطلاح کا ہمیشہ مذاق اُڑاتا۔ غالباً اپنی جگہ سے تانگے تک پہنچنے اور رقعہ تھام کر جیب میں ڈالنے تک کے مختصر سے وقفے کی طوالت نے مجھے تھکا دیا تھا یا رقعہ پکڑنے کے عمل میں میرے حواس اتنے کھچاؤ میں تھے کہ بعد میں مجھے متلی کا احساس ہونے لگا۔ بھاری سر اور ٹوٹتے بدن کے ساتھ میں اپنی منزل میں گیا۔ مجھے رقعہ پڑھنے کی جلدی تھی اور خوف بھی تھا کہ اُس کے اندر ایسا کچھ نا لکھا ہو جسے پڑھ کر مجھے خفت اُٹھانی پڑے۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور کانپتے ہاتھوں سے رقعہ جیب سے نکالا۔ اُس وقت کی مخصوص سنسنی سے میں ایک طرح سے اعصابی ارتعاش میں مبتلا ہو گیا؛ مجھے اپنے ہاتھوں کے لرزے پر اختیار نہیں تھا۔ چھاتی کے اندر دل کی دھڑکن اتنی گونج دار تھی کہ مجھے لگا کسی تیز چلنے والے کی آوازِ پا ہے۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پایا اور منہ کے کڑوے ذائقے کو تھوک کے ساتھ نگلا۔ میں نے رقعہ نکال کر ایک نظر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ پورے صفحہ پر کچھ لکھا ہو گا لیکن ٹیڑھی لکھائی میں لکھی ایک سطری تحریر پڑھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔

''شام کو اپنی بالکونی میں آنا۔'' یہ اقرارِ محبت کے بجائے ایک حکم نامہ تھا۔ میں جس نفسیاتی اُلجھن میں سے گزر رہا تھا یک دم جاتی رہی اور میں نے خود کو کسی حد تک آزاد محسوس کیا۔ اُس نے مجھے بالکونی میں بلایا تھا جو میرے خیال میں سب سے غیر محفوظ جگہ تھی۔ میرے لیے سہولت یہ تھی کہ میں نے دروازہ کھول کر بالکونی میں کھڑے ہو جانا تھا۔ گلی کے اُس طرف سہرا بیل دوسری کھڑکی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی اور اُس کی بھاری سی خوشبو کی وجہ سے کسی کا دیر تک وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔

میں شام کو اپنی بالکونی میں جا کے کیا کروں گا؟ میں اُسے دیکھ نہیں سکوں گا اور بغیر دیکھے گفتگو تو ٹیلی فون کی کال کی طرح ہوتی ہے۔ میں پریشان اور کسی حد تک مطمئن شام ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ کئی طرح کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ کیا میں اُسے پہچان پاؤں گا؟ اُسے پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ یہاں وہی آئے گی جس نے تانگے میں سب کے سامنے ایک سطری رقعہ دیا تھا اور یہ وہی لڑکی تھی جسے میں کئی دِنوں سے دیکھنا چاہ رہا تھا؛ میرا اُس کے ساتھ بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا، بس ایک تجسس تھا اُسے دیکھنے کا۔ کیا میں اُس کے ساتھ بات کر سکتا تھا؟ جیب سے رقعہ نکالتے ہوئے اگر میری یہ حالت ہو گئی تھی تو بات کرتے وقت کیا میں اُس کا سامنا کر پاؤں گا؟

میرا ذہن اُس دیگ کی طرح تھا جس میں پکتے ہوئے سالن میں بلبلے بنتے رہتے ہیں۔ میں سوچے جا رہا تھا اور کوئی حل نہیں نکال پا رہا تھا؛ ایک واضح حل کی طرف میری سوچ دانستہ نہیں جا رہی تھی اور وہ تھا کہ رقعہ پھاڑ پھینکوں اور مقررہ وقت پر بالکونی میں نا جاؤں! لیکن شاید میں جانا چاہتا تھا لیکن اقرار کرنے سے خائف تھا۔ میں اپنی آرام کرسی میں بیٹھ گیا اور اُس ٹیڑھی لکھائی کو پڑھنے لگا!
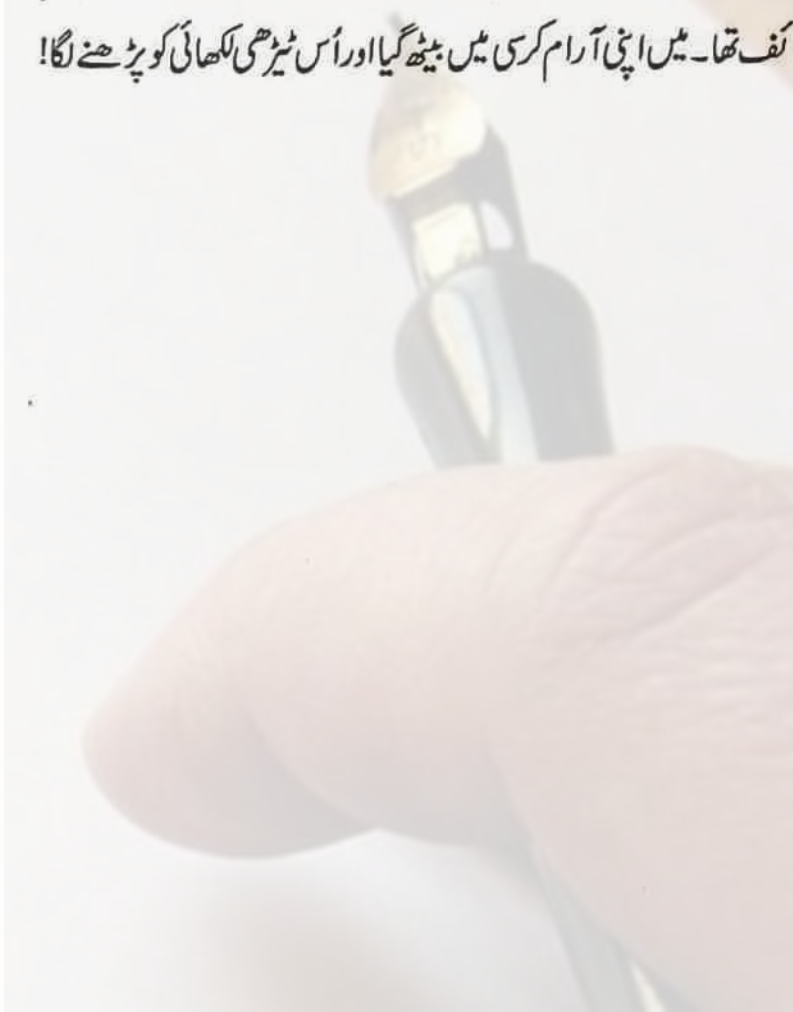
گلی میں ہمارے گھر دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

خواجہ محبوب پنجابی تھے اور اُن کے رہن سہن میں پنجاب رچا بسا ہوا تھا۔ مرد گھر کے اندر دھوتی میں ہوتے، اونچی آواز میں گفتگو کرتے اور اُن کے بلند قہقہوں کی گونج میں سے ٹپکتی مٹھاس مَیں بالکونی میں بیٹھا ہوا بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اُن کی بیوی گہرے رنگ پہنتیں، سارا دن گپ لگاتے کھانے پکاتی رہتیں۔ مجھے اُن کے اجنبی اور کسی حد تک اکھڑ لہجوں میں اپنایت کے ساتھ ایک خوش گوار سی اجنبیت بھی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھار مجھے وہ شور کرتے چڑیوں کے غول کی طرح لگتے جس کی چہچہاہٹ میں سنے چلے جانا چاہتا تھا۔ وہ گورے چٹے اور صحت مند تھے اور اُن کے اندر آباد خلوص کی شگفتگی اُن کے چہروں پر کھنڈی ہوتی تھی۔ ہم لوگ تو ایک تکلف کے دریچے میں کھڑے ایسی زندگی گزار رہے تھے جو اُن سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے کھانے سادہ اور ذائقے میں ذرا مختلف تھے۔ روٹی، دال، سبزی اور چاول ہر خاندان کے پسندیدہ کھانے تھے جنھیں گھی کے بجائے سرسوں کے تیل میں پکایا جاتا۔ ہم دھیمے لہجے میں بات کرتے اور اپنا مقصد واضح کرنے سے کسی حد تک گریز کرتے۔ مرد پاجامہ پہنتے جس کے پائنچے کھلے ہوتے اور عورتوں نے ساڑھی لپیٹی ہوتی لیکن اماں جان نے پاکستان آنے کے بعد اِسے ترک کر دیا تھا۔

اُس تنگ سی گلی میں دو تہذیبیں سانس لیتی تھیں!

ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے، خواجہ محبوب ہماری زبان کی وجہ سے ہمیں ملنے سے کتراتا تھا۔ گو میں نے پنجابی کسی سے سیکھے بغیر گلیوں میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے سیکھ لی تھی اور میرا لہجہ اور گالیوں کا ذخیرہ اُتنا ہی وافر تھا جتنا کہ اُن کا۔ مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا کہ میرا اُردو کا لہجہ یا تلفظ وہ

نہیں رہا جو ابا، اماں جان یا میرے چھوٹے بھائیوں کا تھا۔ کبھی کبھار ابا مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ جیسے ہی آواز آتی: ''وصی! اِدھر آؤ!'' میں سمجھ جاتا کہ نصیحتوں کی پٹاری میں سے کئی سانپ نکلیں گے جو ایک دوسرے کو کھانے کے بجائے مجھ پر حملہ آور ہوں گے۔ ''دیکھو میاں!'' عموماً وہ مجھے بیٹا کہ کر مخاطب کرتے تھے، ''زبان ہر تہذیب کی پاسبان ہوتی ہے۔ مراد آباد سے یہاں آباد ہونے کا مقصد قطعاً نہیں کہ اپنی زبان یا اُس کے لہجے یا تلفظ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا جائے۔ سکھ دور میں کابل میں منتقل ہونے والے سکھ وہاں آج بھی پنجابی ہی بولتے ہیں، یہ نہیں کہ اُنھیں پشتو یا دری نہیں آتیں۔ وہ گھروں میں پنجابی ہی بولتے ہیں۔ ہم نے تو چند سالوں میں ہی خود کو بدل لیا۔''

ابا کی اِس منطق کو غلط ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کئی دلائل تھے، میں یہ بھی جانتا تھا کہ اُنھوں نے یہ بھی بتانا تھا کہ 1881ء تک اور بعد میں اُردو زبان کو نچلے درجے پر دھکیلنے اور ہندی کو بلند مقام دینے میں کتنی ناانصافیاں ہوئیں۔ وہ بھوج پوری کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بھی ذکر کرتے اور ساتھ یہ بھی ہمیشہ سمجھاتے کہ ہم نے اِس علاقے میں اقلیت رہتے ہوئے اکثریت پر غلبہ پانا ہے، جس کے لیے اپنے تمدن کی حفاظت از حد ضروری ہے۔

مجھے خواجہ محبوب ایک کھلے دل اور ذہن کا آدمی لگا، ہم شاید اُس کی طرح نہیں تھے۔ مجھے اُس میں کسی قسم کا تعصب یا جھجک نظر نہیں آئے۔ وہ جب کبھی گلی میں ملتا تو ایک انوکھی قسم کی بے اعتنائی کے ساتھ جس میں محبت اور خلوص کے ساتھ شک کا ایک پہلو بھی نظر آتا۔ اُسے میرے بہاری مہاجر ہونے کی وجہ سے کوئی علاقائی شک تھا یا میرا پنجابی طور طریقہ شبہے میں مبتلا کر دیتا۔ وہ میرے لباس کو غور سے دیکھتا جیسے کوئی فقرہ چست کرنا چاہتا ہو۔ مجھے اُس میں اتنی سی دل چسپی تھی کہ وہ ہمارا واحد ہمسایہ تھا اور میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ہر آدمی زندگی میں کئی نقاب اور بہروپ بدلتا ہے۔ میں خواجہ کا اصل روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا وہ اُتنا ہی فراخ دِل تھا جتنا کہ نظر آتا یا اُس نے کوئی خول چڑھا رکھا تھا؟ ابا جمعہ کی نماز باقاعدگی سے مسجد میں ادا کرتے۔ باقی نمازوں کی ادائی میں وہ اتنے باقاعدہ نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے: مسجد میں جا کر ہم اپنے اردگرد کے معاملات سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں اور میں اپنی گلی میں پھیلی ہوئی گندگی کے بارے میں وہاں بات کرتا ہوں جس پر کبھی عمل درآمد بھی ہو جاتا ہے، ورنہ شاید انبار میں اضافہ ہوتا جائے۔ کبھی کبھار ابا مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ گلی میں بعض اوقات خواجہ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ وہ ابا کے ساتھ نہایت

احترام سے ملتا، جیسے وہ اُس کے لیے بہت اہم ہوں۔ مجھے اُسے ابا کے ساتھ ملنے میں احترام اور میری طرف طنز سے دیکھنے میں نہایت واضح فرق محسوس ہوا۔ اِن دونوں کیفیتوں میں سے ایک درست تھی یا دوسری غلط!

مجھے خواجہ میں ایک تضاد نظر آیا: وہ، وہ نہیں تھا جو نظر آ رہا تھا۔ مجھے اُس کی بیٹی کو صرف ایک نظر دیکھنے کی حد تک دل چسپی تھی جب کہ اُسی بیٹی نے مجھے شام کو ملنے کا کہا تھا۔ رقعہ میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔ کیا وہ اُس کی بیٹی تھی؟ ایسے تو نہیں کہ وہ اُس کی بیٹی ہو ہی نا اور وہ اپنی دوست کے ساتھ مل کر میرا مذاق اُڑا رہی ہو؟ میں نے جیب میں پڑے رقعے کو محسوس کیا۔ وہ اُسی طرح وہاں پڑا میرے خواب کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر باہر دیکھا، شام ہونے میں ابھی دیر تھی اور مجھے بھوک نے بھی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے ایک دم یاد آیا؛ اُس نے مجھے ملنے کا کہا تھا، وقت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ کسی وقت بھی آ سکتی تھی، ابھی سے لے کے شام تک؛ بہتر تھا کہ میں اُس کا انتظار کرتا!

مجھے بھوک ستا رہی تھی لیکن میں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسی انتظار کی طوالت میں مَیں کہیں سو گیا اور مجھے ایک عجیب سے احساس نے جگا دیا، ایسے لگا کہ کوئی میرے پاس کہیں پر مجھے بلا رہا ہے۔ میری نیند جاتی رہی اور میں اپنے اردگرد کسی حرکت کے انتظار میں چوکس ہو کے بیٹھ گیا۔ مجھے اچانک سہرا بیل میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اُس طرف دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا، لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی ہے! میں اُٹھا اور اپنی بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ میں اِس وقت وہاں کبھی گیا نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی روشنی تھی اور اِس وقت وہاں کھڑے ہونا مجھے معیوب لگا کرتا تھا۔ میں اُس وقت وہاں آ کر بیٹھتا تھا جب کوئی مجھے دیکھ نا سکے کیوں کہ اماں جان نے میرا اوپر رہنا ختم کر دینا تھا۔

میں وہاں کھڑے بیل کے اندر دیکھتا رہا۔ جب میں اپنی جھجک اور اُلجھن پر قابو پا چکا تو مجھے بیل کے دوسری طرف کسی کی موجودگی کا یقین ہو گیا۔ پھر مجھے شاخوں کے درمیان میں ایک حرکت محسوس ہوئی اور میرے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایسی بیلوں میں سانپ ٹھکانہ کیے ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی سانپ نہیں دیکھا تھا، میں خائف ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ وہاں پھر حرکت ہوئی، یہ ایک طرح سے بے جھجک سی حرکت تھی۔ میں کچھ پریشان بھی ہوا، کیا وہاں اتنا بڑا سانپ ڈیرا ڈالے ہوئے تھا؟ اُسی وقت ایک ہلکی سی سیٹی سنائی دی، میں کچھ سمجھا اور کچھ پریشان

ہوا۔ میں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے جواب میں ویسی ہی سیٹی بجائی۔ میری سیٹی کے جواب میں ایک ہلکا سا قہقہہ گونجا۔ میں جواب میں ہنس نہیں سکتا تھا۔ میرا گلا خشک ہو گیا تھا اور سانس گلے کے کانٹوں میں سے اُلجھتی ہوئی آ رہی تھی۔ میرے سامنے وہ لڑکی تھی جس نے مجھے رقعہ دیا تھا لیکن کیا یہ وہی لڑکی تھی؟ مجھے کبھی سفید رنگ والی لڑکیاں ایک ہی جیسی لگا کرتی تھیں اور عین ممکن ہے یہ وہ لڑکی ہے جو تانگے میں ساتھ بیٹھی تھی۔

وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں اُسے پتوں، پھولوں اور ٹہنیوں میں گھرے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹ اور آنکھیں ایک مدہوش سی مسکراہٹ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا کہ وہ میری بے یقینی کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اِس طرح کھڑے کھڑے اندھیرا ابھی ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ چلی جائے۔ مجھے لگا کہ میں نے اپنے ہونٹ سکیڑے ہیں، یہی کہا جاتا تھا کہ میں سوچتے ہوئے ایسے کیا کرتا ہوں۔ میں بے ساختگی سے مسکرا دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے اُس کے قہقہے میں ایک تازگی محسوس ہوئی: ایسی تازگی جس کا میں عادی نہیں تھا۔ میں نے تو صرف اماں جان کی تلخ، تند، ترش، گھبراہٹی، عدم دلچسپ سی طنزیہ اور کبھی کبھار خوشی میں ڈوبی ہنسی سنی تھی لیکن میں تازگی میں ڈوبی ایسی مخموری ہنسی کا عادی نہیں تھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

''نام کیا ہے.....'' وہ رکی، جھجکی، مسکرائی اور نیچے گلی میں دیکھا، ''تمھارا؟''

میں اب پُر اعتماد تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا، وہ اُسی طرح بیل کے اندر کیا فلوج ہو کے کھڑی تھی۔

''وصی!'' میں نے بھی نیچے گلی میں دیکھا، وہاں اب روشنی کم ہو گئی تھی، ''اور آ....'' میں جھجکے بغیر رکا، ''تمھارا؟''

''نوید!'' میں نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے پتوں میں ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی، جیسے کوئی بگولہ گزر رہا ہو اور اُسی بگولے میں نوید گم ہو گئی۔

میں اب ہر روز صبح تیار ہو کے گھر سے نکلتا، میں نے تانگوں کا تعاقب کرنے والے اُن تینوں کی طرح نا تو گلے کے بٹن کھولے ہوتے نہ ہی کالر اُٹھایا ہوتا اور ماتھے پر بالوں کی لٹ بھی نہ ہوتی۔ میں گلی کے باہر اپنا بائیسکل لا کے اُسے سیٹ کے نیچے رکھے کپڑے سے صاف کرنا شروع کر دیتا گو یہ مشہور تھا کہ میرا بائیسکل جب سے خریدا گیا تھا کبھی صاف نہیں کیا گیا تھا جس میں صداقت بھی تھی۔ میں اُن تینوں کی طرح نوید کے تانگے کا پیچھا نہیں کرتا تھا، بس اُسے گلی سے نکلتے ہوئے دیکھتا اور جب وہ تانگے میں سوار ہو رہی ہوتی تو نظر جھکا کر الوداعی سلام کرتا جس کا جواب وہ اپنی دوستوں کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے دیتی۔

کالج میں میرا دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا، پہلے میں اکیلا ہی تھا اور زیادہ پیریڈوں میں میری غیر حاضری لگتی۔ میں کبھی پریشان بھی ہوتا کہ کم حاضریوں کے سبب میرا بی اے کا داخلہ نا روک لیا جائے۔ کلاسوں میں جانا اپنے آپ کو امتحانوں کے لیے تیار کرنا نہیں تھا بلکہ اب ایک طرح کا معمول سا بن گیا تھا کہ کہیں بیٹھنا ہی ہے، کیوں نا کلاس روم میں بیٹھ لیا جائے!

کینٹین میں تین طرح کے لڑکے بیٹھتے تھے۔ ایک وہ جو ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور فحش قسم کے چٹکلے سناتے جو وہاں موجود سب لوگوں کو محظوظ کرتے اور وہ اپنی چٹکلے بازی اور گالی گلوچ کو مزید دل چسپ بنانے کی کوشش میں اور بھی فحش ہو جاتے۔ دوسرے ہمارے جیسے لڑکے تھے جو صرف چائے پیتے، سگریٹوں میں ساجھے داری کرتے اور موسیقی اور فلموں پر دبے لہجوں میں بات کرتے۔ ہمیں وہاں شور سے کوئی دل چسپی نہیں تھی، ہم اپنے موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے۔ ہمیں وہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ ہمیں اُن کے ہنگاموں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ تیسرے چند وہ لوگ تھے جو اپنی اپنی

کرسیوں پر خاموش بیٹھے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ پیتے یا اپنی نوٹ بکس کھولے کچھ لکھتے رہتے۔ میں بھی ایسے ہی بیٹھا سگریٹ پیتے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ اُس خاموشی میں ایک طرح اذیت سے بھری لذت تھی، جی تو اُن ہنگاموں کا حصہ بننے کو کرتا لیکن کوئی نفسیاتی رکاوٹ سامنے آ جاتی جسے کم از کم میں شناخت نہیں کر سکا تھا۔ شبر زیدی کے ساتھ ملنے کے بعد میں اُس تنہائی کی محفل سے نکل کر نام نہاد دانش وروں میں آ گیا تھا۔ وہاں بڑا گروہ گو ہمیں از حد احترام کے ساتھ ملتا لیکن ہمارے جانے کے بعد دل چسپ فقرے پیوست کیے جاتے: ہم باؤ تھے اور ایک دوسرے کو صاحب کہہ کر بلاتے، دوستی کا یہ انداز اُن کے لیے نیا تھا کیوں کہ اُنھوں نے اپنے ہر ایک دوست کے لیے کوئی مخصوص گالی مختص کر رکھی تھی۔

شبر کے والد رات کے کھانے کے بعد ایک پپیتا کھاتے تھے جسے شبر زیدی روزانہ خرید کے لاتا۔ اُسے پپیتا خریدنے کے لیے تین روپے ملتے، پپیتے کی قیمت اڑھائی روپے تھی۔ اٹھنی سے ہم دو چائے کے پیالے اور ایک ریڈ اینڈ وہائیٹ کا سگریٹ خریدتے۔ شبر چار بجے پپیتا خریدنے آتا اور اُس کے انتظار میں مَیں شیش محل کے ہال میں بیٹھا ہوتا۔ وہ ایک سگریٹ ہمارے لیے بہت قیمتی ہوتا تھا کیوں کہ اگلے دن تک ہمارے پاس کوئی پیسہ نہیں ہونے تھے۔ گرمیوں میں ہم پنکھا بند کروا دیتے قطع نظر کہ ہم پسینے میں نہا رہے ہوتے، ہم سگریٹ کا ایک کش بھی ضائع ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ جب ایک کش لگا رہا ہوتا تو دوسرا اُسے بہت حسرت کے ساتھ دیکھتا رہتا، ایک نظر سگریٹ اور دوسری ہونٹوں میں سے خارج ہوتے دھوئیں پر ہوتی۔

یہ ہمارے طالب علمی کی محرومی کے عجیب رومانوی قسم کے دن تھے۔ شبر اور میں ہمیشہ صاف، استری کیے ہوئے پتلون قمیص میں ہوتے، ہمارے جوتے پالش اور کچھ عرصے سے میں نے اپنا بائیسکل بھی صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ڈاڑھی بنانا میرے گھر میں ایک روایت کا حصہ تھا۔ ابا ہر روز ڈاڑھی بناتے جب کہ میں ہفتے میں دو یا تین مرتبہ ایسا کرتا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر اپنے مخصوص موڑھے پر بیٹھ جاتے، اُن کے سامنے میز رکھ دی جاتی۔ چھوٹے بھائیوں میں سے ایک دروازے کی باہری کنڈی میں پھنسا اخبار نکال لاتا تب تک اماں جان تام چینی کے مگ میں اُبلتا ہوا پانی میز پر رکھ چکی ہوتیں اور ابا خود جا کر ڈاڑھی بنانے والا سامان لے آتے۔ وہ سیفٹی ریزر میں سے کل کا استعمال کیا بلیڈ نکال کر سیون او کلاک یا ٹریٹ کا نیا بلیڈ لگانے کے بعد برش اور سیفٹی ریزر مگ میں رکھ کے اخبار کھول لیتے۔ اُسی دوران میں اماں

ٹرے میں پانچ چائے کے پیالے لیے آجاتیں۔ہم سب ابا کے سامنے بیٹھ جاتے اور خاندان کی دن کی واحد بے تکلفانہ گفتگو شروع ہوجاتی۔ابا اخبار پڑھتے ہوئے تبصرہ بھی کرتے جاتے ،ساتھ ڈاڑھی مونڈنے کا کام بھی چلتا رہتا۔وہ کبھی تام چینی کا مگ اُٹھا کر ایک گھونٹ لے کر بُرا سا منہ بنا کے قہقہہ لگا کے ہنسنے لگتے اور ہم سب بھی اُن کی ہنسی میں شامل ہوجاتے ،اسی طرح کبھی وہ چائے کے پیالے میں برش ڈبو دیتے اور پھر وہی قہقہے شروع ہوجاتے۔اُنہی قہقہوں کے بیچ میں ایک دن میں نے بتایا کہ Brush Less Shaving Cream بنالی گئی ہے جس کا ابا نے بہت برا منایا۔''دیکھو میاں !'' بے تکلفی کا ماحول یک دم بھک سے اُڑ گیا۔میرے چھوٹے بھائی سہم گئے۔''برش کے ساتھ جھاگ بنانا کیا لطف دیتا ہے۔پہلے برش کو گیلا کر کے چہرے پر لگاؤ اور پھر کریم لگا کے جھاگ بناتے جاؤ۔اب یہ جھاگ بنانا ہی شیو کرنے کا مزہ ہے ورنہ تو صابن سے جھاگ بنا کے بھی شیو ہوسکتا ہے۔''

ہم ابا کے مزاج کی اچانک تبدیلیوں سے بخوبی واقف تھے۔وہ ہر قسم کی روایت کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتے تھے اسی لیے اُنھیں شیونگ کریم میں نئی ایجاد پسند نہیں آئی تھی۔جن دنوں میں مَیں ڈاڑھی بناتا وہ ہمیشہ اپنے سامنے آئینے میں چہرے کو دیکھتے ہوئے مجھے مخاطب کرتے:''بڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ گھر سے نکلتے وقت مجھے لگتا ہے کہ کسی چوراہے میں بھیک مانگنے جارہا ہوں۔اگر شوق ہے تو ڈاڑھی رکھ لو لیکن بڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ گھر سے کبھی نا نکلو۔ابا مرحوم کہا کرتے تھے کہ گھر میں جو کھایا جائے کون دیکھتا ہے لیکن لباس اور حلیے پر ہر کسی کی نظر ہوتی ہے۔'' یہ سنتے ہوئے میں کالج تک پہنچتا اور تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اِن باتوں کے دہرائے جانے نے میرے اندر ایک بغاوت کو جنم دیا جو مجھے تہہ بند بندھوانے لگی لیکن ان باتوں کا ایک گہرا اثر بھی ضرور تھا کہ میں کالج ایسے لباس میں جاتا جو ابا اور اُن کے ابا کی خواہش کے مطابق تھا۔

میرا نوید کے ساتھ دوبارہ رابطہ نہیں ہوا گو ہم ہر روز ایک دوسرے کو علامتی سلام ضرور کرتے گو مجھے کبھی خیال آتا کہ نوید تو پہلا رابطہ کر چکی تھی اور اُس رابطے کو متحرک رکھنے کے لیے اُس کو کسی قسم کا پیغام دینا میری ذمے داری تھی۔کیا میں وہ کرسکوں گا جو اُس نے کیا؟ جو اُس نے کیا اُسے کیا کہا جاسکتا ہے ؟ حماقت؟ دلیری؟ ایک وقتی فیصلہ جس کو دہرانے کی کوشش نہیں کی گئی!اُس مختصر سی ملاقات میں مجھے کہیں بھی کوئی غیر اہم چیز محسوس نہیں ہوئی؛ وہ ہلکے سے مزاج میں ڈوبے رہنے کی حد تک سنجیدہ تھی یا سنجیدہ ہونے

کی حد تک مجھے اپنی گرفت میں لے چکی تھی لیکن کیا میں اُس کے کیے کا جواب دے سکوں گا؟ کیا گیند میری طرف پھینک دی گئی تھی؟ میں نے اچانک محسوس کیا کہ اب مجھے اُس کے ساتھ رابطہ کرنا چاہیے۔ کیا میں اُس کی طرح دلیری یا حماقت کروں؟ میں جانتا تھا کہ دونوں کو نظر نا آنے کی حد تک باریک خط جدا کیے ہوئے ہے چناں چہ اُس کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھے احمق ہونے کی حد تک دلیر ہونا پڑے گا یا دلیر ہونے کی حد تک احمق! کیا میرے لیے یہ اقدام ممکن ہوگا؟ میں ایک ہجوم کی موجودگی میں اُسے رقعہ نہیں دے سکوں گا۔ ایک بار میں لاہور پلازہ سینما میں فلم دیکھنے گیا۔ ہاف ٹائم میں مجھے پیشاب کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی اور غسل خانوں میں اُسی ضرورت کے تحت گیا۔ جب میری باری آئی تو میں اپنے آپ کو آرام سے نہیں کر سکا کہ مجھے لگ رہا تھا کہ اپنی باری کا انتظار کرنے والے مجھے پیشاب کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ میری حالت غیر تھی لیکن میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ مجھے اپنے سکون کے لیے سینما کے احاطے سے باہر جانا پڑا۔ مجھے ہجوم کے بجائے نوید کے ساتھ کہیں تنہائی میں رابطہ کرنا ہوگا۔ اُس شام شبر کے ساتھ شیش محل کی معمول کی ملاقات کے بعد گھر واپس آیا تو ابا اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھ کر اوپر والی منزل پر چلا گیا۔ مجھے اچانک نوید سے ملنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی؛ ویسی کیفیت تھی جیسی پان کھانے کے بعد سگریٹ نا ملنے پر ہو۔ میں کچھ دیر کمرے میں بیٹھا لائحہ عمل پر غور کرتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نا پہنچ سکا۔ مجھے شرمساری بھی ہو رہی تھی کہ میں نوید کے ساتھ دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا۔ شاید اُس نے صرف اِس لیے رابطہ نا کیا ہو کہ وہ تو ایک تعلق کا آغاز کر چکی تھی اور اب میری ذمے داری تھی کہ میں اِس رشتے کو قائم رکھوں یا ختم کر دوں! میں اِسے ختم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جاری رکھنے سے خائف تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں اپنی کرسی سے اُٹھ کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ میرے سامنے گلی کے اُس پار سہرا بیل روز کی طرح اپنے پھولوں کے نرم سے بوجھ تلے دبی مغرور اور لاتعلق سی کھڑی تھی۔ مجھے لگا کہ میں بھی اُس بیل کی طرح ہوں، گو میں کسی قسم کا نرم سا بوجھ نہیں اُٹھائے ہوئے تھا۔ نوید کے ساتھ ملاقات کے علاوہ مجھے بالکونی میں کھڑے ہونے کا کبھی مزا نہیں آیا تھا؛ میں اِسے ہمیشہ ایک بازاری اور غیر اخلاقی فعل سمجھتا تھا کیوں کہ کھڑکیوں، بالکنیوں اور پردوں کے پیچھے کھڑے ہو کر سامنے والے گھروں میں جھانکنا غیر اخلاقی عمل تھا اور ہم لوگ ایسا کرنے والے شناساؤں کو پسند کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

مجھے بالکونی میں کھڑے ہونے سے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا۔ سامنے بیل اتنی نزدیک

تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر پھول توڑ سکتا تھا اور اتنی دور کہ میں اُس کا تنا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک گھنی بیل تھی جو کئی سالوں سے بالکونی کو اپنی لپیٹ میں لیے جا رہی تھی۔ میں اُس کے گہرے سبز پتوں اور گلابی پھولوں کو دیکھے جا رہا تھا کہ سیٹی کی ہلکی سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ ایک لمبی، چھوٹی اور پھر ایک لمبی سیٹی تھی۔ اور پہلی بار کی طرح میں نے بھی ایسی ہی سیٹی سے جواب دیا۔ پتوں میں ایک حرکت ہوئی اور غالباً اُس نے اپنا کیمافلاج توڑ دیا تھا کہ میں اُسے دیکھ سکتا تھا۔ سہرا بیل کے گلابی پھول اُس کے ماتھے، رخساروں اور بالوں کو چھو رہے تھے۔ وہ باریک نقوش والی ایک خوب صورت لڑکی تھی اور اُس کا سفید رنگ گھنی بیل کے گہرے سائے میں پانی میں چاند کے عکس کی طرح لہرا رہا تھا۔ میں دم بخود اُسے دیکھتا تھا اور وہ پھولوں میں گھری مجھے دیکھتی تھی اور مسکراتی تھی۔ ہم اِسی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے؛ وہ مسکراتے ہوئے اور میں مسکرانے سے خائف!

''زبان نہیں ہے؟'' ہنسی میں دبی سرگوشی میرے کانوں میں رس گھول گئی۔

میں نے پہلے تو نفی میں سر ہلایا اور پھر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ مجھے اپنے کان تپتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ بھی ایک قہقہ لگا کے ہنس پڑی۔ قہقہے کی آواز مجھ تک نہیں پہنچی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ قہقہہ ہی ہے۔ ''خاموشی ہمیشہ الفاظ سے زیادہ پر معنی ہوتی ہے۔'' میں نے بھی سرگوشی کی۔ میں جانتا تھا کہ اماں جان کی سننے اور سونگھنے کی حس بہت تیز ہے اور میری آواز نوید تک شاید پہنچے کہ نا مگر اُن کے کانوں میں گدگدی ضرور کر جاتی۔

نوید کے ہونٹوں سے یک دم مسکراہٹ غائب ہو کر اگلے ہی لمحے پلٹ آئی، مجھے لگا کہ سورج کے سامنے سے گہری سیاہ بدلی گذر گئی ہے۔ ''تم نے بہت گہری بات کہہ دی ہے۔'' نوید اب سنجیدہ تھی۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی لیکن اُس کے چہرے پر پچھلی مسکراہٹ کا عکس ابھی تک ٹنگا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہاں اب ایک گمبھیر قسم کی صورتِ حال بن گئی تھی اور میں نے سوچا کہ چند سیکنڈ کی بھاری خاموشی کو توڑنے کے لیے مجھے کچھ کہنا چاہیے۔ میں کچھ ایسا بھی نہیں کہنا چاہتا تھا جو اُس موقع کی مناسبت سے نا ہو۔

''اتنی بھی گہری نہیں کہ تم حیران ہو جاؤ۔ اِس میں اتنی ہی گہرائی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے یا اتنی ہی سطحی ہے جتنی Common Sense اجازت دیتی ہے۔'' میں نے اپنی طرف سے بات کو ایک ہلکا سا

مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ جب میں نے یہ کہا تو اُس وقت وہ ماتھے کے سامنے آئے گلابی پھولوں کے ایک گچھے کو پرے کر رہی تھی۔ میری بات سنتے ہی اُس نے تیزی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ مجھے اُس کے ردِعمل پر حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مسکرا دے گی لیکن مجھے اُس کی نظر کی جارحیت نے کسی حد تک مایوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر معمول کی دل نشیں مسکراہٹ اپنی سجاوٹ کا عکس چھوڑ جائے گی۔

''ہر بات کا ایک مقصد ہوتا ہے اور مجھے بغیر مقصد کے بات پسند نہیں۔'' نوید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں نے اُسے دیکھا، وہ شام کے وقت سمندر میں دور کہیں لنگر ڈالے ہوئے کشتی کی طرح کھڑی تھی۔ بیل نے اُس کو سانپ کی طرح لپیٹا ہوا تھا۔ سانپ کا خیال آتے ہی میں خوف زدہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی پرانی بیلیں سانپوں کے کئی خاندانوں کا مسکن ہوتی ہیں۔ میں نے ایک وحشت کی کیفیت میں نوید کی طرف دیکھا، وہ مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ شاید ایک ساکت بگولہ اُسے ہڑپ کر گیا تھا۔
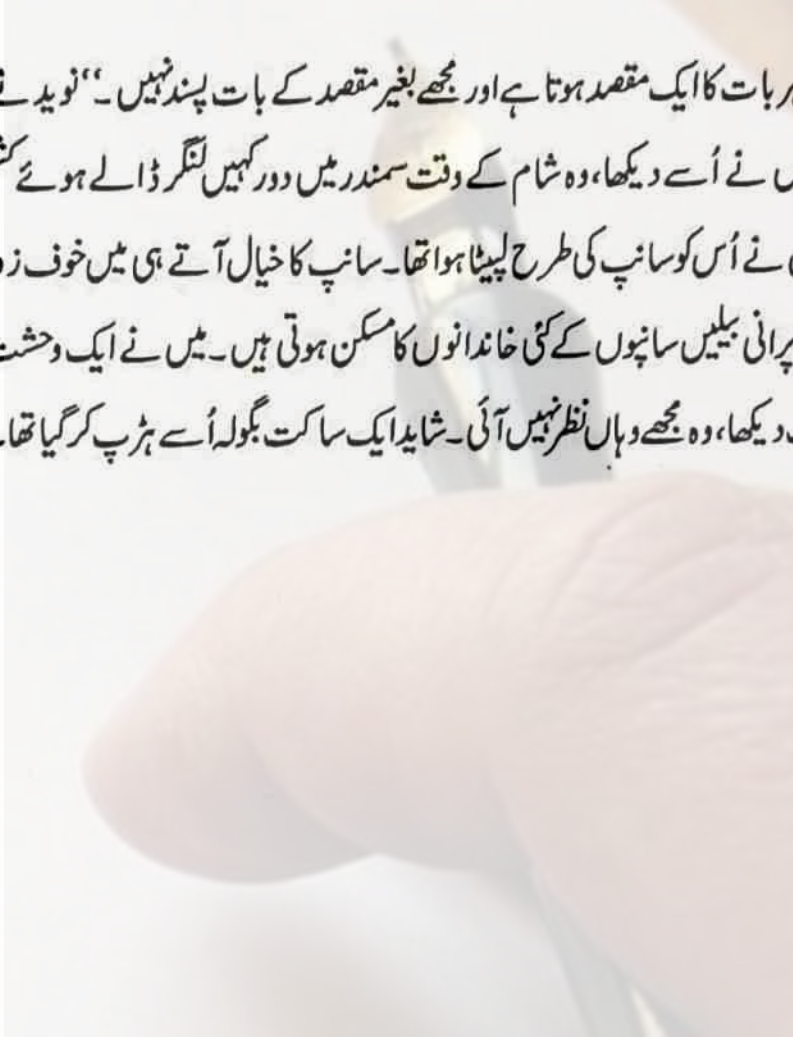
اُس رات میں عجیب سے فریب ہائے خیال میں مبتلا رہا۔ یہ ایک بے ربط طویل خواب کا سلسلہ تھا جو مسلسل چلے جا رہا تھا اور میں بھی چاہتا تھا کہ ختم نا ہو۔ اُس میں ریگستان تھے، گھوڑے تھے اور سانپ تھے، زہریلی آندھی تھی اور میں راہ کھو کر نوید کو ڈھونڈتے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں صرف سانپ تھے۔ میں سانپوں سے بہت خائف ہوں، شاید اِس لیے کہ میں نے زندگی میں کبھی سانپ دیکھے ہی نہیں تھے۔ میرے ہر طرف سانپ تھے؛ بعضوں کی کھال پر منکے بنے ہوئے تھے اور کچھ کی پر لکیریں تھیں۔ وہ سب مست و بے حال لیٹے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ مجھے اُن کی زبان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی دبا سا قہقہہ بھی بلند ہو جاتا۔ اُس قہقہے میں اتنا طنز ہوتا کہ میرا جی جاگ جانے کو کر آتا لیکن میں جاگ کر اپنے خواب کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سانپوں سے نا ڈرنے کا فیصلہ کر کے اُن کے ساتھ لیٹ گیا۔ ایک سانپ نے کہ جو میرے نیچے آ گیا تھا آخرِکار مجھے ڈس گیا۔ میں خوف کے مارے جاگ گیا لیکن میری آنکھ نہیں کھلی۔ نوید کہیں سے آ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور میں نے جب اُسے دیکھا تو وہ زار و قطار رہ رہی تھی۔ میں اُسے چھونے کے لیے اُٹھنا چاہتا تھا لیکن کوئی چیز مجھے جکڑے ہوئے تھی۔ مارے خوف کے میں بھی رونے لگا۔ ہمارے ساتھ سانپ روتے ہوئے بین کرنے لگے۔ مجھے کسی کے فوت ہونے پر پرسہ دینے والی عورتوں کے بین یاد آ گئے۔ مجھے اچانک ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا اور مجھے اپنا جسم بے جان ہوتے محسوس ہوا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میں مر رہا ہوں۔ میں نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان میں کہا کہ مجھے ڈسنے والا سانپ زہریلا نہیں تھا۔ میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اُس وقت تک پورا ریگستان سانپوں سے بھر چکا تھا۔ تمام سانپ قہقہے لگا رہے تھے اور اُن کے قہقہوں کی گونج

سے سویا ہوا ریگستان جاگ اُٹھا۔ یہی کہا جا رہا تھا کہ سانپ کے زہر میں موت ہوتی ہے، وہ کم زہریلا ہو یا زیادہ۔ میں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ ایک جھٹکا لگایا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا، باہر رات نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا اور میں چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ بیل کی بھاری خوشبو نے میرا سواگت کیا۔

میں وہاں کھڑا اپنے خواب کے خوف کو کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خوف، میرے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ مجھے اپنے اردگرد سانپ گھر بنے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے ہلنا مجھے موت محسوس ہوا اور لگا کہ ساکت رہنے میں ہی زندگی ہے سو میں جہاں کھڑا تھا وہیں سے کھڑے سامنے بیل میں دیکھنے لگا۔ وہاں ایک طویل سایہ تھا جو مجھے گھور رہا تھا۔ آغازِ خزاں کی قدرے خنک ہوا کا جھونکا میرے جسم میں ایک خوش گوار سی کپکپی دوڑا گیا، مجھے اپنے جسم میں ایک تازگی کا احساس ہوا۔ میں نے اُس نوتازگی کے ساتھ اپنی طرف گھورتے ہوئے سائے کو دیکھا۔ اب مٹتے ہوئے اندھیرے کے اُجالے میں بیل کچھ واضح نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے وہاں ایک حرکت سی محسوس ہوئی؛ نا تو ہوا کے جھونکے نے پتوں کو گدگدایا تھا اور نا ہی کسی نے اپنے کیموفلاج کو کھول کے خود کو سامنے رکھا تھا۔ مجھے بغیر سرسراہٹ کے ایک آواز کا حساس ہوا۔ میں نے اُس طرف ٹکٹکی لگا کے دیکھا تو مجھے ایک ٹہنی کے ساتھ لپٹا ہوا سلیٹی رنگ کا سانپ نظر آیا۔ میں نے پہلے سانپ نہیں دیکھے تھے۔ وہ ٹہنی سے سر اُٹھائے میری طرف اپنائیت سے دیکھتے ہوئے تیز رفتار کے ساتھ زبان کو حرکت دیے جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بڑا سانپ ہے یا چھوٹا! اُسے دیکھتے ہوئے مجھے اپنی پنڈلی میں خارش کا احساس ہونے لگا جہاں خواب میں مجھے سانپ نے ڈسا تھا۔ سانپ کو انسان کا دشمن کہا جاتا ہے اور انسانی زندگی میں متعدد علامتیں اِس کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ مجھے اُسی طرح دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ٹہنی کے ساتھ لپٹا ہوا کسی رسی کی طرح زندہ لگ رہا تھا اور مجھے اُس کی بدصورتی میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی نظر آئی جسے میں نظرانداز کرنا چاہتا تھا۔

میرے اندر یہ خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی کہ میں ڈسے جانے والی جگہ کو دیکھوں اور یہ خوف روکے ہوئے تھا کہ اگر وہاں مجھے ڈس لیا گیا ہوا تو کیا کروں گا؟ مجھے اچانک نوید کا خیال آیا۔ سانپ عین اُس جگہ پر تھا جہاں نوید کھڑی ہوا کرتی ہے۔ مجھے ایک اُلجھن نے گرفت میں لے لیا۔ ایسا تو نہیں کہ نوید

نے یہ سانپ پالا ہوا ہو یا جیسا کہ اساطیر میں کہیں درج ہے، ایک مخصوص عرصے کے بعد سانپ کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سانپ سے انسانی روپ میں ڈھل جانے والے لوگوں کی آنکھوں میں ایک جنونانہ شدت ہوتی ہے اور وہ آنکھیں بھی نہیں جھپکتے۔ مجھے نوید کی آنکھوں میں ایک شدت تو نظر آ رہی تھی لیکن میں اُس کی پلکوں کو جھپکتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا جو میں کل دیکھوں گا!

میں یہ فیصلے کرتے ہوئے سانپ کو بھول چکا تھا اور جب میں نے اُس طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ مجھے ایک طرح اطمینان بھی ہوا کہ میں سانپ کی موجودگی سے آزاد ہو گیا ہوں کیوں کہ گلی کے پار اُس کا موجود ہونا میرے لیے اُلجھن کا سبب بننے لگا تھا۔ میں نے طمانیت میں ڈوبی ایک لمبی سانس لی اور مجھے حیرانی ہوئی کہ میں جس جذباتی کشمکش میں سے گزر رہا تھا اُس کی اصل وجہ کے بارے میں مَیں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نوید کو پسند کرنے لگا تھا!

میں خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے احساسات کے ساتھ خاندان کی صبح کی بغیر تکلف والی محفل میں شریک ہوا۔ مجھے سب لوگ غیر معمولی طور پر خوش لگے، معمول سے زیادہ قہقہے بلند ہو رہے تھے اور میں اپنی ہی خوشی اور مستی میں گم سب باتوں پر ایک ست سی مسکراہٹ سے اُن کو دیکھتا رہا۔ مجھے اپنا آپ ہلکا پھلکا ہونے کے باوجود ایک بھاری بوجھ کے تلے دبا ہوا محسوس ہوا۔ میرے اندر سرشاری کا ایک بہاؤ تھا جو مجھے ساتھ بہائے چلے جا رہا تھا۔ میں اپنے بہترین لباس میں نوید کو نظر آنا چاہتا تھا۔ کالج جاتے ہوئے میں عموماً بہت ست رفتار کے ساتھ بائیسکل چلاتا تھا لیکن آج میرا دل تیز رفتار سے جانے کو کر رہا تھا، شاید مجھے شبر سے ملنے کی جلدی تھی۔ کیا میں اُسے بتانا چاہتا تھا؟ مجھے اِس سوال کا جواب نہیں ملا؛ مجھے بتانے میں ایک طرح سے جھجک محسوس ہوئی اور نا بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں لگا۔ میرے اندر بار بار نوید کی سیٹی اور سرگوشیانہ ہنسی گونج رہی تھی۔ اُس نے مجھے ہوا سے ہلکا کیا ہوا تھا اور میری اپنی جھجک مجھے لنگر انداز کیے ہوئے تھی۔ مجھے کیا جھجک تھی؟

میں بائیسکل لیے گھر سے باہر نکلا تو سڑک پر ابھی تک تانگہ نہیں پہنچا تھا۔ جہاں تانگہ کھڑا ہوا کرتا تھا میں نے بائیسکل اُس کے نزدیک کھڑا کیا اور جب تانگہ آیا تو میں پاس ہی تھا۔ کوچوان نے اپنے پاؤں کے نیچے لگے گھنٹے کو دو مرتبہ بجایا، میں بظاہر اپنے ہی خیال میں گم بائیسکل کی صفائی میں لگا رہا اور اُسی وقت نوید میرے پاس سے گزری۔ وہ اتنی قریب سے گزری تھی کہ میں اُس کے پاؤڈر کی خوشبو کو سونگھ سکتا تھا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک مجھے غور سے دیکھا، مجھے اُس کی نظر میں ایک تعریفی پہلو نظر آیا۔ پلکیں جھکا کر میرے معمول کے سلام کے جواب میں اُس نے ایک غیر متوقع کام کیا؛ اُس نے ماتھے پر ہاتھ لے

جا کے میرے سلام کا جواب دیا۔ مجھے جب سے اُسے پسند کرنے کا احساس ہوا تھا، اُس مختصر سے وقت میں میری سوچ کئی زمانوں کا سفر طے کر گئی تھی مگر نوید کا سلام ایک جھٹکے کے ساتھ گلی کے سامنے لے آیا جہاں نوید کے کوچوان نے چلنے سے پہلے ایک گھنٹہ بجایا۔

بائیسکل چلاتے ہوئے میرا ذہنی اور جسمانی نظام معمول پر آ گیا اور نوید کے سلام کا خوف آہستہ آہستہ میرے اندر سے خارج ہونے لگا۔ میں جب کالج پہنچا تو میری طبعیت اُسی طرح بشاش تھی جیسے کہ گھر سے نکلتے وقت! نوید نے مجھے سلام کیا تھا جو اردگرد کے کئی لوگوں نے دیکھا ہوگا، جیسے اُس نے ریلوے پھاٹک پر کتنی کھوجتی آنکھوں کے سامنے رقعہ میری طرف بڑھا دیا تھا۔ شبر کینٹین میں میرے انتظار میں بیٹھا تھا تا کہ سگریٹ میں ساجھے داری کی جا سکے۔ اُس نے جراب میں سے ڈبیہ نکالی جس میں پانچ سگریٹ تھے۔ یہ ایک غیر معمولی اور خوش گوار عیاشی تھی۔ کبھی میں بھی ایسے ہی ڈبیہ میں چند سگریٹ لا کے ایک سگریٹ نکال کر ڈبیہ پھینک دیتا تھا اور بعد میں موقع ملتے ہی جراب میں اُڑس لیتا۔ ایک دن شبر نے فرش پر سے ڈبیہ اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ کر کہا: ''آپ چوتیا بناتے ہیں!'' میں دیر تک ہنستا رہا۔

''زیدی صاحب! مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔'' میں نے کش لے کر بغیر تمہید کے بات شروع کی۔ اُس نے آنکھیں گھما کر آسمان کی طرف دیکھا اور صلیب کا نشان بنایا۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے، دونوں کو انتظار تھا کہ دوسرا بات شروع کرے۔ میں نے پہل کرنے کا سوچا۔ ''لڑکی میری پڑوسن ہے۔''

''مجھے یہ ہی معلوم نہیں کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''نوشہرہ روڈ۔'' معلوم نہیں میں نے کیوں جھجکتے ہوئے کہا۔ شاید نوشہرہ روڈ کسی حد تک پس ماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا؛ مجھے معلوم تھا کہ شبر سول لائن میں رہتا ہے جو ہر شہر کا ایک پوش علاقہ سمجھا جاتا رہا ہے اور وہاں رہنے والے پرانے محلوں کے رہائشیوں کو پسند نہیں کرتے تھے یا تنگ و تاریک گلیوں کی وجہ سے اُن کا مذاق اُڑاتے۔

''وہاں ہمارے بھی ایک جاننے والے رہتے ہیں؛ ابا کے اُن کے ساتھ قریبی مراسم ہیں۔''

''کون؟'' میں نے عدم دل چسپی سے پوچھا۔

''ابا اُن کے وکیل بھی ہیں۔ مجھے مقدمے کا تو نہیں پتا۔'' ہماری دوستی صرف کالج، شیش محل

اور فنونِ لطیفہ پر مباحث تک محدود تھی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو اِس سے آگے جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اُس کے ابا کے بارے میں اتنا معلوم تھا کہ وہ روز ایک پپیتا کھاتے تھے کیوں کہ باقی پیسوں سے ہم آدھا سیٹ چائے اور سگریٹ پیتے تھے۔ نوید کی وجہ سے آج ہمارا تفصیلی تعارف ہو رہا تھا۔ مجھے مقدمے اور وکیل سے شک سا گزرا۔

''آپ کے ابا نوشہرہ روڈ پر کس کے وکیل ہیں؟''

''بشیر علی خان صاحب کے۔ اُن کا جائداد کا مقدمہ ہے۔ ابا تو فوجداری کے ضلع میں اچھے وکیلوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن یہ دیوانی مقدمہ اُنھوں ذاتی تعلق کی بنا پر لیا ہے۔''

''بشیر علی خان میرے والد ہیں۔'' میں نے کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ کچھ دیر ایک خاموش سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں مسکراہٹ کی وجہ جاننا چاہتا تھا لیکن بظاہر لاتعلق سا بیٹھا رہا۔

''اماں جان کو یہ مقدمے بازی پسند نہیں۔ ہمارے ہاں ہر تیسرے دن یہ بحث چل رہی ہوتی ہے۔'' میں یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ بحث کی اصل وجہ تو فیس تھی۔ شبر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نے آپ کا گھر دیکھا ہوا ہے۔ ایک دفعہ ابا کا پیغام دینے آیا تھا۔''

میرے لیے اب موقع تھا کہ نوید کے بارے میں بتاؤں۔ ''وہ لڑکی بھی اُسی گلی میں رہتی ہے۔'' میں نے وکیل اور موکل کی بات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا، اُس کے ماتھے پر سلوٹیں اُبھر آئیں تھیں۔

''گوری چِٹی ؟'' میں خاموش رہا۔ ''وہ تو چالو ہے، آپ اُس میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟'' مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے لگا جیسے میرا بغیر بریک والا بائیسکل نوید کے تانگے کے پہیے کے ساتھ ٹکرا گیا ہو۔ میں نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔ ''اُس کے متعلق جو بھی کہا جائے لیکن سالی ہے دلیر! اُس نے جو کرنا یا کہنا ہو، کر جاتی ہے قطع نظر کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔'' اُس کے لہجے میں تضحیک میں ڈوبی ہوئی دل چسپی تھی۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ ''جو بھی اُس کے پیچھے جائے وہ اُس کو ایک عدد رقعہ پہنچا دیتی ہے۔''

''آپ کو کیسے علم ہے؟''

''لڑکیوں کے تانگوں کے پیچھے جانے والے سب بتا دیں گے۔''اُس کی آواز میں برہمی تھی۔

''آج کل اُس کا پیچھا کوئی نہیں کر رہا۔'' پھر مجھے ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میں نے شاید قبل از وقت اپنی رائے دے دی تھی۔ شبّر نے شاید میرے مشاہدے پر غور نہیں کیا تھا یا اُس نے خاموشی کو ہی اپنی رائے جانا۔

''کیا آپ پیچھا کر رہے ہیں آج کل؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ مجھے اُس کے کہنے میں کوئی دل چسپی یا طنز محسوس نہیں ہوا۔ لگا کہ اُس نے جو کہنا تھا سو کہہ دیا۔

''اپنے ابا کو مت بتایئے کہ آپ اور میں ایک دوسرے کو جانتے ہیں، ورنہ ہم ہرکارے بن جائیں گے۔'' میں ابھی تک شبّر کی پچھلی بات کے اثر سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پایا تھا اِس لیے میں نے اُس کے کہے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ''اور میں آپ کو منع تو نہیں کروں گا لیکن اتنا کہوں گا کہ اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو بنانے میں احتیاط رکھیے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ مال کھاتی ہے۔''

شبّر جو بتا رہا تھا میں ایسے حالات سے واقف نہیں تھا۔ وہ مال کیسے کھاتی ہوگی؟ نقد مانگتی ہوگی؟ میں تو سگریٹ کی ڈبیہ خریدنے کی حیثیت میں نہیں تھا۔ کیا وہ کچھ مانگ کرتی تھی؟ وہ کیا مانگ سکتی تھی؟ کپڑے؟ خوشبوئیں؟ کریمیں؟ میں تو کچھ بھی اُس کو مہیا کر کے نہیں دے سکتا تھا؟ میری اُس کے ساتھ دو ملاقاتیں ہوئی تھیں اور وہ مجھے ایک سادہ سی مگر کسی گھٹن کا شکار لڑکی لگی!

''ہم مال کھلوانے کے قابل ہیں؟'' میں نے اپنی ہنسی کو طنز سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ وہ بھی میری ہنسی میں شریک ہو گیا۔

''کلاس کا وقت ہو گیا ہے!'' شبّر نے مجھے یاد دلایا۔

''آپ جائیں اور اگر ہو سکا تو میری حاضری بھی بول دیں۔ خطرہ کوئی نہیں لینا۔''

''جلال پوری صاحب کی کلاس ہے!'' اُس نے مجھے یاد دلایا۔ ہم عموماً ایک دوسرے کی جگہ پر حاضری بول دیا کرتے تھے لیکن جلال پوری صاحب کے پیریڈ میں ایسا کبھی نہیں کرتے تھے۔ وہ فوراً جان جاتے تھے کہ جعلی حاضری بولی جا رہی ہے اور وہ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے ایسے دیکھتے تھے جیسے جان گئے ہوں؛ اُنھوں نے کبھی کسی کو کھڑا نہیں کیا تھا۔

''آپ جائیں اور حاضری والی بات بھول جائیں۔''

میں جس خوشی سے گھر سے نکلا تھا وہ اب جاتی رہی تھی۔ شمّر نے مجھے کافی پریشان کر دیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر ایسے ہی خالی الذہن بیٹھا رہا۔ میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا! شمّر نے جو مجھے بتایا تھا اگر وہ درست ہوا تو کیا میں نوید سے ملوں گا نہیں؟ مجھے ملنے میں کوئی حرج نظر نہیں آیا لیکن اگر اُس نے کچھ مانگ لیا؟ میں مایوس سا اُٹھ کر بائیسکل سٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ مجھے کالج میں ٹھہرنا نا قابل برداشت قسم کا بوجھ لگ رہا تھا۔ میں سیٹلائیٹ ٹاؤن کی مارکیٹ تک پیدل آیا اور پھر بغیر کچھ سوچے آہستہ آہستہ پیڈل مارتا لڑکیوں کے کالج کی طرف چل پڑا۔ کالج کے بڑے گیٹ کے سامنے حسبِ معمول کچھ تانگے کھڑے تھے جن میں نوید والا نہیں تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ بائیسکل سوار کھڑے تھے جو کسی کو لینے نہیں آئے تھے اور صرف تانگوں میں بیٹھی ہوؤں کو محفاظت گھروں تک بچیاں کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ میں نے دوسرے گیٹ کا بھی چکر لگایا۔ اُس کا تانگہ وہاں بھی نہیں تھا۔ شاید ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی! میں کیا کروں؟ اُس کا انتظار کروں اور بعد میں تانگے کے تعاقب میں چل پڑوں! مجھے یہ سفر ہمیشہ گھٹیا اور بیمار لوگوں کا کام لگتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل پڑا۔ میں کچھ پریشان سا تھا، شاید میری پریشانی کی وجہ متعدد مفروضے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ شمّر کی اطلاع درست ہو۔

میں جب گھر پہنچا تو اماں جان ابھی باورچی خانے میں تھیں اور ماسی نلکے کے کھرے میں اپنی ترتیب لگائے بیٹھی تھی۔ وہ مجھے یہاں بیٹھی ہوئی ہمیشہ ایک اہم ہستی لگا کرتی تھی۔ اُس کے اردگرد کپڑوں کا ڈھیر اُسے ایک نا قابلِ یقین حد تک خوب صورت بنا دیتا؛ ویسے وہ عمر میں اماں جان سے کافی بڑی تھی۔ اماں جان مطمئن تھیں کہ وہ اُن سے بڑی ہے اور اُنھیں ماسی کی اہلیت، وفاداری اور موقع شناسی پر پورا اعتماد تھا۔ عموماً اِس وقت اماں جان کسی کا گھر میں موجود ہونا پسند نہیں کرتی تھیں۔ میں نے جب اُنھیں مصروف دیکھا تو بغیر کوئی آہٹ کیے اوپر چلا گیا۔ میں جب بھی اوپر آتا مجھے وہاں کوئی تبدیلی محسوس نا ہوتی۔ وہی نیند میں ڈوبا ہوا کمرہ، کونے میں رکھی میز پر پڑا ریڈیو، ایک طرف کتابوں کی الماری، میری آرام کرسی جس کی کوئی جگہ نہیں تھی، میں اُسے کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ سامنے، بالکونی کے پار سہرا بیل جو ہر وقت کسی سوچ میں گم شاید کئی راز اپنے گھنے پن میں چھپائے ہوئے تھی۔ اِس وقت وہاں چڑیوں کا شور تھا جو مجھے پسند آ رہا تھا۔ اُن کے شور میں ایک ربط تھا؛ عجیب بات تھی کہ یہ ایک بے ربط سا شور تھا اور شاید

مجھے اِسی لیے اِس میں ایک ربط محسوس ہوا۔ میں اپنی آرام کرسی پر آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں سو رہا ہوں یا میں جاگ رہا تھا اور نیند مجھے جاگنے کی کیفیت میں سے نکال کے سلا رہی تھی۔ یہ ایک آنکھ مچولی تھی جو میرے حواس میرے ساتھ کھیل رہے تھے اور اِس آنکھ مچولی میں مَیں سچ مچ سو گیا۔ کیا میں جاگ رہا تھا؟ نہیں میں سو رہا تھا جب کہ میں جاگنا چاہتا تھا۔

میں خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے کوئی خواب دیکھنا چاہیے۔ ایسی کیفیت میں سوئے رہنا ہی مناسب ترین حل ہوتا ہے اور غالباً میں سویا رہا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھا، مجھے لگا کہ کسی نے مجھے جھنجوڑ کے اُٹھایا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً اماں جان آئیں کیوں کہ سونے سے پہلے میں اُنھیں ہی دیکھ کے اوپر آیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ اُنھوں نے مجھے جھنجوڑا ہے۔ جب میں اُس نیند کی گہرائی سے باہر نکلا تو اپنے آپ کو اُس بچے کی طرح محسوس کیا جو ڈوبتے ڈوبتے، دریا سے باہر نکل کے زندہ رہنے کے لیے رو رہا ہو۔ میری آنکھیں کھلنے کے بعد نرم سے اندھیرے سے ٹکرائیں؛ چڑیوں کا شور ختم ہو چکا تھا اور اُس نرم سے اندھیرے میں نرم سی خاموشی بھی شامل ہو گئی تھی۔ مجھے اچانک سونے سے پہلے والی کیفیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور میں ایک طرح سے مایوسی کی زد پر آ گیا۔ کیا نوید مال کھاتی ہے؟ کیا وہ چالو ہے؟ چالو سے شمر کی کیا مراد تھی؟ جن لوگوں میں مَیں بیٹھتا تھا وہاں چالو سے مراد وہ عورت تھی جو فوراً شلوار کھول دیتی ہو۔ شمر نے نوید کو چالو کہا تھا تو کیا وہ...... میں نے سوچنا بند کر دیا اور بالوں میں انگلی کرتے ہوئے بالکونی میں آ گیا۔ بیل کے پھولوں کی بھاری خوشبو میں دم گھٹتا سا محسوس ہوا۔ میں نے اِس گھٹن سے رہائی پانے کے لیے آسمان کی وسعت کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور پھیپھڑوں میں سے ہوا نکالتے ہوئے سامنے بیل کی طرف دیکھا تو وہاں نوید کھڑی تھی۔ مجھے اُس کے وہاں ہونے سے حیرت ہوئی لیکن شاید میں اوپر آنے کے بعد یہی چاہتا تھا۔ اُس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کے مجھے سلام کیا اور میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُسی طرح جواب دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور مجھے اُس کی مسکراہٹ میں اپنے والی بے یقینی محسوس نہیں ہوئی۔ میں ایک طرح اُس کے اعتماد سے چڑ بھی گیا۔ مجھے شمر کا کہا سچ لگنے لگا اور میں خائف بھی ہو گیا کہ وہ پیسوں کی مانگ نا کر دے۔ مجھے یک دم احساس ہوا کہ میں چاہتا بھی تھا کہ وہ مجھ سے کچھ مانگ کرے تا کہ میرے پاس وہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز تو ہو۔

وہ اُسی طرح مسکرائے جا رہی تھی۔ اُن چند لمحوں کی مسکراہٹ میں وہ مجھے ایک ماہر مسکرانے

والی لگی؛ایک پیشہ ور مسکرانے والی! کیا وہ چالو تھی۔ میں اُس کی مسکراہٹ کے سحر میں گم اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے وہ ایک خواب لگی لیکن اچانک خیال آیا کہ میں تو ڈراؤنے خواب دیکھنے کا عادی تھا۔

''میں کافی دیر سے تمھیں سوئے ہوئے دیکھ رہی تھی۔'' اُس نے بھاری سی سرگوشی میں کہا۔ میں نے رُخ پھیر کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی آسن میں کھڑی مسکرائے جا رہی تھی۔ میں کیا جواب دیتا، میں چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی کھڑی مسکراتی جائے اور میں اپنی بے یقینی کے بوجھ تلے دبا اُسے دیکھتا رہوں۔

''جگا لیتیں !'' مجھے اپنی سرگوشی نرم سے اندھیرے میں سمبل کی مائی بوڑھی کی طرح ہوا میں لہراتی محسوس ہوئی۔

''کیسے؟'' اُس کی سرگوشی میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے لمبی، چھوٹی اور پھر ایک لمبی سیٹی بجائی۔ اُس نے بھی جواب میں وہی سیٹی بجائی۔
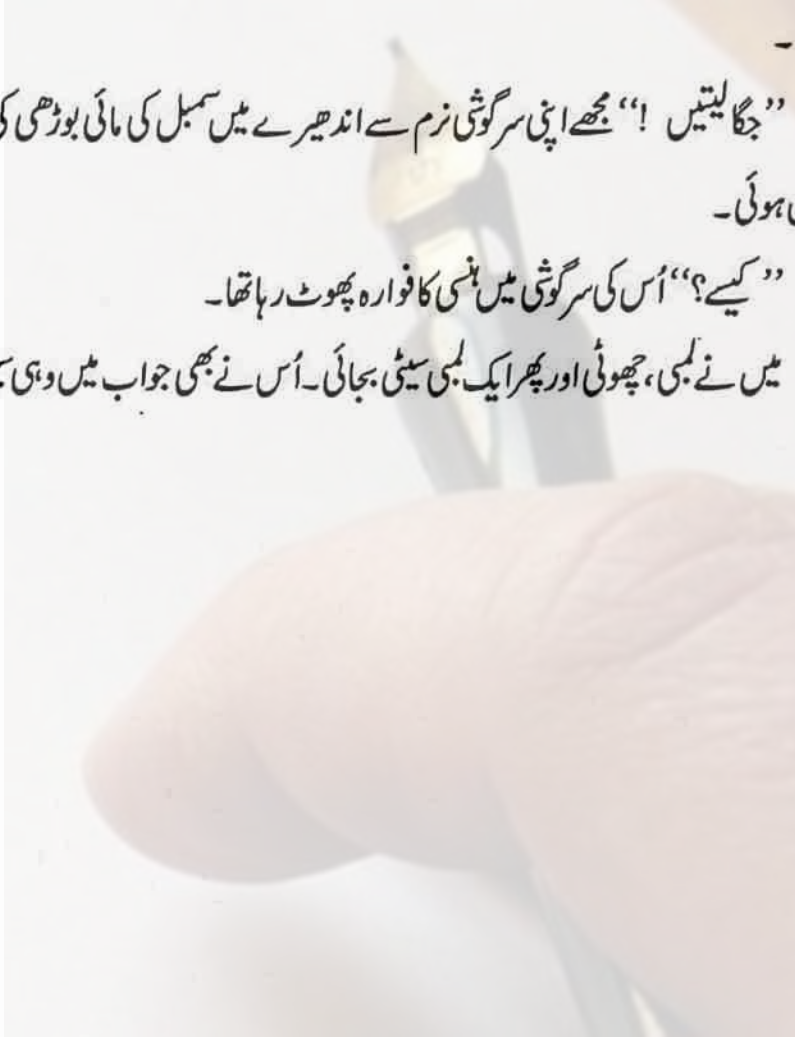
میں نوید کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کچھ ایسے ہوا کہ میں وقت اور خلا کی قید سے آزاد ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے ایک الگ دنیا تعمیر کر لی جس میں کسی کو دخل نہیں تھا۔ میں کتابوں میں گم ہو گیا۔ ہر گلی میں پیسہ لائبریری تھی اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں بیشتر کا ممبر بن گیا۔ کسی لائبریری سے میں کتاب لا رہا ہوتا تو کسی کو واپس کر رہا ہوتا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے اردگرد کی لائبریریوں میں کتابیں کم ہو گئی ہیں یا میں اُنھیں پڑھے جا رہا تھا۔ یہ بھوک تھی یا پیاس جو مٹ نہیں رہی تھی اور میں دیوانہ وار پڑھے ہی جا رہا تھا۔ مجھے پروا نہیں تھی کہ میں کیا پڑھ رہا تھا؟ مجھے ایک کتاب چاہیے تھی جس پر کچھ تحریر ہو اور میں اُن الفاظ میں سے معنی کشید کرتا جاؤں۔ میں نے ایسی کتابیں بھی پڑھیں جن میں عورت اور مرد صرف ہم بستری کرتے تھے اور وہ عمل ہی اُن کی کہانی تھی۔ اُن میں عورتیں مردوں کی بھوکی اور مرد جنس زدہ تھے۔ ایسی کتابیں بھی تھیں جن کا ہیرو مسلمان، ہیروئین غیر مسلم تھی اور جس کے لیے اپنا مذہب بدل کے مسلمان ہو جانا ضروری تھا اور ایسی کتابیں جن میں طوائف کو جذبات اور احساسات سے بھری ہوئی ایک عورت دکھایا تھا جسے معاشرہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ غربت کی چکی تلے پستے ہوئے لوگوں کی کہانیاں جن کی محبت میں ناکامی، وصل میں محرومی اور فراق اذیت میں ڈوبا ہوا ایسا لطف تھا جسے آسودہ حال لوگ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ کتاب میری ضرورت تھی یا میں کتاب کو اپنی ضرورت بنا بیٹھا تھا۔ مجھے کتاب نے نوید سے دور کر کے اتنا قریب کر دیا کہ ہر وقوعے میں مجھے وہ موجود لگتی۔ کتابوں کے ساتھ مجھے میرے ریڈیو نے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اُس پر گانے سنتا جب کہ کتاب میری گود میں ہوتی یا میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ہوئے نیم دراز ہوتا اور ریڈیو سے نکلتی موسیقی مجھے جگا کے سلا رہی ہوتی اور سلا کے

جگا رہی ہوتی۔

میں صبح کالج کے لیے نکلتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں کیوں کہ میں رات دیر تک جاگتا تھا۔ میں جو کرسی پر نیم دراز جاگتے رہنے کی کوشش میں سو جایا کرتا تھا، اب جاگتے ہوئے سونے کی کوشش میں رہتا لیکن نیند نہیں آتی تھی۔ مجھے اپنی اِس کیفیت پر کبھی رحم اور کبھی غصہ آتا۔ اپنی اُس حالت میں مجھے نوید کا بہت کم خیال آتا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ صرف اُس کی وجہ سے تھا۔ رحم اور غصے کے ساتھ ساتھ مجھے وہ کبھی بہت شدت سے یاد بھی آتی۔ ایسی صورت میں مَیں اپنے دروازے میں سے بیل کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا اور اِسی کوشش میں ہوتا کہ شاید وہ نظر آ جائے!

وہ مجھے صرف اُس وقت ہی نظر آتی جب کالج جانے کے لیے تانگے میں سوار ہو رہی ہوتی اور ماتھے پر سے لٹ ہٹاتے ہوئے مجھے سلام کرتی۔ یہ ہی ہمارا رابطہ تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ بالکونی میں آ کے میرے ساتھ بات کرے، میں اُس کی بھاری سرگوشی اور سیٹی سننا چاہتا تھا۔ میں اُس کی مسکراہٹ کو اُس کے باریک ہونٹوں پر تیرتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، میں اُس کی آنکھوں کی چمک سے شام کے اندھیرے کو جگ مگ کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بیل کے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کو اُس کے ماتھے کو چھوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جب سیٹی بجا رہی ہوتی تو اُس کے ہونٹ اُس طرح ہو جاتے جیسے سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے میرے ہو جاتے تھے، میں نوید کے ہونٹوں کو اُسی طرح سکڑے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

کبھی میری کیفیت عجیب سی ہو جاتی۔ مجھے وہ کتابیں یاد آ جاتیں جن میں مرد اور عورت کے جنسی کھیل کو تلذذ کے ساتھ بیان کیا گیا تھا اور مجھے اُس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھنے کی خواہش آن دبوچتی۔ مجھے اپنے بدن میں ایک ٹوٹتی ہوئی تھکاوٹ کا احساس ہوتا اور میں جسم میں خون کی گردش کو حرکت میں رکھنے کے لیے بائیسکل پر ایمن آباد کی طرف نکل جاتا۔ اور میں ہینڈل کو پکڑے، سر کو جھکائے ایک ہی رفتار سے پیڈل چلاتا جاتا۔ اِس سفر کے دوران میں مجھے عجیب قسم کے سکون کا احساس ہوتا۔ میں اپنے خیالات میں گم چلتا رہتا۔ وہ ایک نئی دنیا تھی جو میں نے تعمیر کر لی تھی اور میں اُسی فینٹسی میں گم چلے ہی چلا جاتا۔ بائیسکل میرے لیے بے معنی ہو جاتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ نوید میرے ساتھ ہے۔ میں ہالوسی نیشن اور فینٹسی میں گم ایک جنونانہ سی کیفیت میں چلتا رہتا۔ اُس وقت میں وصی احمد خان

کے بجائے کوئی جنونی ہوتا جس پر نوید کا آسیب قابض تھا جو شاید کاموں کے جا کے ہی رکے۔ میں کاموں کے تک کبھی گیا نہیں تھا۔ راستے میں کہیں مجھ پر منطق کا غلبہ ہونے لگتا۔ مجھے اپنی اُس کیفیت پر ترس آنا شروع ہو جاتا اور میں اچانک اپنے آپ سے مایوس ہونے لگتا۔ بعض اوقات میں چیاں والے بنگلے میں جا کر، جو کاموں کے سے چند میل پہلے واقع تھا، نہر کے کنارے بیٹھ کر پانی کو بہتے ہوئے دیکھتا اور سوچتا کہ کیا محبت میں ایسے ہی ہوتا ہے یا میں ابھی ناتجربہ کار تھا؟ نہر کا پانی ایک ہی رفتار سے بہتا اور میں سوچتا کہ اِس کے بہاؤ کو سائنس نے ایک طرح کی یکسانیت دی ہوئی ہے، پانی کو کناروں کے اندر قید کر کے خصی کر دیا گیا ہے۔ اِس میں وہ شدت نہیں جو سیلاب کے پانی میں ہوتی ہے۔ کیا میری محبت میں وہ شدت نہیں جو سیلاب کے پانی میں ہوتی ہے؟

بنگلے میں گھنے درخت کھلے لانوں پر سایہ کیے ہوئے تھے اور عمارت کسی خواب میں گم لگتی تھی۔ میں وہاں جا کر اُسی خواب کا حصہ بن جاتا، مجھے محسوس ہوتا کہ درخت، لان، عمارت، ایک ہی رفتار سے بہتا ہوا پانی میرے غم خوار تو ہیں لیکن اُنھیں میرے ساتھ دل چسپی نہیں۔ وہ سب ایک بے مقصد سے وجود تھے جنھیں وہاں کھڑا کر دیا گیا تھا لیکن نہر کا پانی؟ وہ تو آسمان کی طرح تھا؛ غصیلہ لیکن جذبات سے عاری!

بنگلے تک بائیسکل چلانا ایک تھکا دینے والا عمل تھا جس کا احساس مجھے واپسی پر ہوتا۔ جی ٹی روڈ پر ٹریفک اپنی رفتار سے چلتا رہتا لیکن میں اُس ٹریفک کا کبھی حصہ نہیں بنا تھا۔ میں اپنی دھن میں مگن پیڈل چلاتا جاتا اور ریڑھے تک مجھ سے آگے نکلتے جاتے کیوں کہ میں تھک چکا ہوتا تھا۔ گھر پہنچ کر میں یہی سوچتا کہ اب کبھی اُس طرف نہیں جاؤں گا لیکن مجھے میرا جنون پھر ایک دن کھینچ کر اُسی بنگلے تک لے جاتا۔ مجھے وہ بنگلہ کبھی اپنی پچھلی جنم بھومی لگتا کہ مجھے وہاں گہرے سکون کا احساس ہوتا، وہ جگہ جانی پہچانی لگتی؛ مجھے ہر درخت کئی بار دیکھا ہوا لگتا۔ برگد، پوپلر، سمبل، ٹاہلی، کیکر، آم اور پیپل کے عمر رسیدہ درخت اُسے خوب صورت بنانے کے علاوہ ایک وقار بھی دیتے تھے۔

دھان کے کھیت کاٹے جا رہے تھے جب میں پہلی مرتبہ وہاں گیا۔ وہ علاقہ روس سے آنے والے چڑوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہ چڑے وزن اور سائز میں مقامی چڑوں سے بڑے تھے اور انھیں پکڑنا شکار کے ساتھ ساتھ ایک معاشی عمل بھی بن گیا۔ خالی کھیتوں میں جال بچھے ہوتے اور یہ پرندے ہزاروں

کی تعداد میں دھان کے خالی کھیتوں میں اُترتے جہاں جال اُن کے منتظر ہوتے۔ اُن جالوں کے ذریعے ہزاروں کی تعداد میں پکڑے جانے کے بعد گوجرانوالہ کے تکے بنانے والے، شکاریوں سے خرید کر لے جاتے۔ میں نے اُن کٹے ہوئے کھیتوں میں جال بچھے ہوئے دیکھے اور پھر چڑوں کی ڈاروں کو اُن کھیتوں میں اُترتے ہوئے دیکھا جہاں وہ دھان کو چگنے کے لیے اُترتے تھے۔ وہ معصوم جنھوں نے روس کی شدید برف باری سے خائف ہو کے پاکستان کے گرم میدانوں میں پناہ لی تھی اور جو لالچی شکاریوں کے جالوں سے بے خبر کٹے کھیتوں میں گرے دانوں کو چگنے کے لیے اُترے تھے، بسیار خوروں کی بھوک کی زد پر آ گئے۔ میں نے وہی پرندے سیال کوٹی دروازے کے باہر اور تھانے والے بازار میں تکوں کی دکانوں میں سیخوں میں پروئے، دہکتے ہوئے کوئلوں پر بھنے جاتے دیکھے اور لوگوں کو دیوانہ وار اُنھیں ہڈیوں سمیت کھاتے دیکھا۔ میں چیاں والا بنگلے میں اِس شکار کو دیکھنے کے بجائے وہاں پھیلے ہوئے سکون تلے اپنی بے چینی کو دبانے گیا تھا اور مختلف قسم کے جالوں میں اُن معصوم پرندوں کو اپنی زندگی کے لیے اُس وقت اپنے غیر اہم پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ کر آزردہ ہو گیا تھا۔ مجھے سہرا بیل میں کھڑی نوید یاد آ گئی تھی!

ہمارے ہاں چاول کم بنتے تھے اور جب کبھی بنتے تو وہ بدذائقہ اور بے خوشبو موٹے چاولوں کی کوئی قسم ہوتی۔ میں پہلی مرتبہ جب بنگلے میں گیا تو پورے میں چاولوں کی ایک ہلکی سی، بھینی بھینی سی، مٹھاس بھری، اشتہا انگیز، میل ہا میل تک پھیلی خاموشی پر وہ خوشبو جس سے میں آشنا نہیں تھا، پھیلی ہوئی تھی۔ میں دیر تک اُس مہک سے اپنی سوچ کو بھرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ نوید مجھ پر غالب آنے لگی اور میں نہر کے کنارے بیٹھ کر پانی کے چھوٹے چھوٹے بھنور ٹوٹ کر بنتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہاں آ کر بیٹھنا ایک طرح کا فرار بھی تھا اور اپنی زندگی سے معانقہ بھی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں نوید کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں ، گو میں اُسے یاد رکھنے کے لیے وہاں تک آتا تھا۔ مجھے بہت بعد پتا چلا کہ زندگی میں بھول جانا، یاد رکھنے کی نسبت، مشکل ہوتا ہے۔ کیا وہ میرے اندر زندہ تھی؟ میں یہی سوچتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ سیٹی کی آواز نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میری کیفیت گہری نیند سے جاگ جاتے والے کی سی تھی جب جاگنے والا طے نہیں کر پاتا کہ وہ صبح کے وقت جاگا ہے یا رات کے کسی پہر؟ میں بے یقینی کی کیفیت میں دوسری بالکونی کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے سیٹی کی آواز کو آنا چاہیے تھا۔ پچھلی چند ملاقاتوں کی طرح یہ شام کا وہ

حصہ تھا جب چیزیں نمایاں ہوتے ہوئے بھی نمایاں نہیں رہتیں۔ میں سیٹی کا جواب دینے کے بجائے بالکونی میں جا کھڑا ہوا اور وہ اُس پھیلتے ہوئے اندھیرے میں مجھے نظر نہیں آئی۔ اُس نے دوبارہ وہی مخصوص سیٹی بجائی تو میں اُسے دیکھ سکا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی، اُس کی نظر میں ایک حیرت بھی تھی، وہی حیرت جو مجھے بنگلے کے عملے کی آنکھوں میں نظر آئی تھی جب میں اپنے بائیسکل پر سوار لان کے سامنے پہلی مرتبہ رکا تھا۔ اُنھیں شاید میرا وہاں آنا پسند نہیں آیا تھا۔ اُن کی حیرت میں مجھے جارحیت بھی محسوس ہوئی تھی جب کہ نوید کی حیرت میں بے یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔ مجھے اُس کی بے یقینی کی کیفیت پر حیرت ہوئی۔

''اتنے دن کہاں تھے؟'' میں اُس کی بے یقینی کی وجہ جان گیا۔ میں اُس سے ملنے سے گریز کرتا رہا تھا، شمر نے مجھے محتاط کر دیا تھا یا میں خائف ہو گیا تھا۔ مجھے اُس کے لہجے کے تجسس سے کچھ اطمینان ہوا۔

''اگر میں کہوں کہ کہیں بھی نہیں تو کیا کہو گی؟'' اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا جس نے اُس شام کو مایوسی سے جکڑ کر رکھنے والی گرہ کو کھول دیا اور میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اور اگر میں کہوں کہ کہیں گیا ہوا تھا تو پھر کیا کہو گی؟''

وہ خاموش مجھے دیکھتی رہی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے دیکھتی رہی تھی کیوں کہ اب اندھیرا اتنا ہو گیا تھا کہ میں اُسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اگر میں اُس کی جگہ ہوتا تو اُسے دیکھ رہا ہوتا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ ڈر رہی ہے۔

''ڈر رہی ہو؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''اندھیرے سے؟'' میں نے تھوڑی اونچی آواز میں پوچھا تا کہ میری آواز واضح ہو۔

''نہیں!'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے ایک دم یاد آیا کہ میں نے بیل پر سانپ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے بدن میں خوف کی کپکپی دوڑ گئی۔

''سانپ سے؟''

''نہیں۔ وہ تو ایک طرح سے پالا ہوا ہے۔''

''خاموشی سے؟'' اُس وقت رات نے اپنے پر پھیلا دیے تھے اور گلی میں مکمل خاموشی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد رات نے ایک دم چونک کے جاگ اُٹھنا تھا۔

''نہیں۔ اُس کی عادی ہوں۔''

''مجھ سے ؟'' میں نے اپنی اُکتاہٹ میں دل چسپی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو !'' وہ تھوڑا سا ہنسی۔ مجھے اُس ہنسی میں طنز محسوس ہوا جس سے مجھے غصہ بھی آیا۔

''پھر کس سے ڈرتی ہو؟'' میں نے کسی حد تک جھنجھلا کر پوچھا۔

''ڈر سے !'' اُس کی سرگوشی بلند تھی۔ میں اُس کی آواز کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اِس جواب کی توقع نہیں تھی۔

''وہ کیسے؟'' مجھے اپنا جواب ناکافی اور جاہلانہ لگا۔

''مجھے یہاں کھڑے ایک عجیب طرح کا احساس ہوتا ہے کہ ایک دم میرا دم گھٹ جائے گا۔ مجھے دم گھٹے جانے سے ڈر آتا ہے۔ مجھے ابھی مرنا نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے یہ سب بول گئی۔

''مرنے میں حرج کیا ہے۔ میں جب چاہوں مر سکتا ہوں۔''

''ایسے نہیں کہتے پلیز!'' اُس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیوں؟'' میں نے کسی حد تک برتری سے پوچھا۔''تم مرنا نہیں چاہتیں؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!''

''کیوں؟''

''میں نے پہلے تمھاری بیوی بننا ہے!'' اُس نے بلند سرگوشی میں کہا۔

اُس کا جواب میرے لیے اتنا ہی حیران کن تھا جتنا کہ اُس کے اپنے لیے۔

میں تھوڑا سا ہنسنا چاہتا تھا اور خاموش رہ کے اُس کی بات پر غور بھی کرنا چاہتا تھا۔

میں کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی اور میں ابھی تک اپنے آپ کو ایک بچہ ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے شادی اور موت کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے سن رکھا

تھا کہ آدمی اور عورت کی عمر کے درمیان میں چند سالوں کا فرق ہونا چاہیے۔ ابا، اماں جان سے سات سال بڑے تھے اور دیکھنے میں اماں جان دس برس بڑی لگتی تھیں۔ اگر نوید مجھ سے کچھ بڑی ہوئی تو! میں اُلجھن میں پڑ گیا۔

''ڈر گئے ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ مجھے اُس کے اعتماد پر غصہ بھی آیا۔

''ہاں!'' میں نے کسی حد تک برہمی سے جواب دیا۔

''کس سے؟'' اِس مرتبہ اُس کے سوال میں مجھے تشویش کا احساس ہوا۔

''تمھارے ڈر سے!''

''ڈرو مت۔''

''کیوں؟''

''میں ایسی ہی ہوں۔''

''کیسی ؟''

''جیسی باتیں کرتی ہوں!''

''تمھاری باتیں تو دل چسپ ہیں۔''

اُس نے ہلکا سا قہقہ لگایا۔ قہقہ لگاتے وقت شاید وہ بھول گئی تھی کہ ہم نے محتاط رہنا ہے؛ اُس کا قہقہ بلند اور ایک کھنک لیے ہوئے تھا، میں نے ایسا شفاف نسوانی قہقہ پہلے نہیں سنا تھا۔ اماں جان کے قہقہے تو پھیکے، بے رس اور اُن کے اپنے جسم کی طرح ڈھیلے ڈھالے سے تھے، شاید قہقہوں کا تعلق جسموں کے ساتھ ہو۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ میں اُس کے قہقہے سے اُس کا جسم محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے جسم کو میں نے ہمیشہ چادر میں لپٹے ہوئے ہی دیکھا تھا اور آج اُس کے قہقہے میں مجھے اُس کا کسا ہوا بدن نظر آ گیا۔

''اور میں سنتے ہی چلے جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیا۔ جب جواب نا آیا تو مجھے اچانک تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ مجھے ٹانگوں میں ہلکے ہلکے، میٹھے میٹھے سے درد کا احساس ہونے لگا۔ آج بھی میں چیاں والے بنگلے تک گیا تھا اور واپسی پر مجھے تھکاوٹ کا اِس طرح احساس نہیں تھا لیکن اُس کے جاتے ہی میں تھک سا گیا۔

''موجود ہو؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے قہقہے سے خوف زدہ ہو کر یا تو نیچے چلی گئی تھی اور یا پھر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''موجود ہو؟'' میری سرگوشی میں جھجک تھی۔ مجھے جواب موصول نہیں ہوا تو تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ ہلکی سی خنکی کا بھی احساس ہوا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں تاروں کا جھلملاتا ہوا جال بچھا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر تاروں کو ملانے کے لیے راستے بناتا رہا اور پھر ایک لمبی سانس لے کے سامنے بیل کو دیکھنے لگا۔ ہوا ساکن تھی لیکن مجھے کبھی کبھی کوئی جھونکا اپنے گالوں سے ٹکراتے ہوئے محسوس ہوتا۔ کسی جھونکے کے ساتھ ہی مجھے بیل میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں سمجھا کہ نوید نے جگہ تبدیل کی ہے یا وہ واپس آئی ہے۔

''موجود ہو؟'' میں نے پھر وہی گردان کی لیکن مجھے جواب نہیں آیا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی لیکن مجھے موجود لگ رہی تھی۔ کیا موجود ہونا، نا موجود ہونا تھا یا نا موجود ہوتے ہوئے موجود ہوا جا سکتا ہے !میں کیا چاہتا تھا؟ یہی کہ وہ موجود رہے اور وہ موجود نہیں تھی لیکن موجود نا ہوتے ہوئے بھی موجود ہوا جا سکتا ہے اس لیے وہ موجود تھی۔ میں اُس کی موجودگی کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے کمرے میں آتے ہی ایک عجیب سے بوجھل پن کا احساس ہوا۔ شاید یہ اُس کی موجودگی کی وجہ سے تھا یا میں اُسے جسمانی طور پر اپنے ساتھ کمرے میں موجود دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر اُس کا قہقہہ اتنا شفاف اور کھنک دار نا ہوتا تو میں اُس کے بدن کی کساوٹ کو محسوس نا کر سکتا اور شاید مجھے بھاری پن کا احساس نا ہوتا۔ مجھے یک دم خیال آیا کہ ایسے تو نہیں کہ مجھے نوید سے زیادہ اُس کا جسم پسند ہو۔ میں میرا جی کے متعلق سوچتا ہوا بوجھل سا اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور صبح جب جاگا تو میری طبعیت میں بوجھل پن نہیں تھا۔

میں اپنی پڑھائی سے پہلے ہی غافل تھا لیکن اب میں نے مکمل طور پر نظر انداز کرنا شروع کر دیا ۔ میں ایک عجیب دور میں سے گزر رہا تھا۔ میں ایک خوشی کے دور میں سے گزرتے ہوئے انتہائی کرب میں مبتلا تھا اور ایک انتہا کے کرب میں سے گزرتے ہوئے خوش بھی تھا۔نوید نے میرے سامنے ایک نیا اُفق کھول دیا تھا۔ وہ جب بیل کے نیچے کھڑی ہوتی تو میں ایک سرشاری کے احساس میں ڈوب جاتا اور جب میں اکیلا ہوتا تو وہ میرے پاس آ کر مجھے نہال کر دیتی۔ کیا مجھے اُس کا بیل کے نیچے کھڑے ہونا پسند تھا یا کمرے کی تنہائی میں در آ کر محفل بپا کرنا؟

وہ کئی دنوں سے اوپر نہیں آئی تھی، جب وہ تانگے میں بیٹھ رہی ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے۔ دزدیدہ سی مسکراہٹ اور ماتھے کو کھجانے یا بال ہٹانے کے بہانے سے سلام کرنا ہی ہماری ملاقات رہ گئی تھی۔ میں اُسے ملنا چاہتا تھا، اِس طرح ملنا چاہتا تھا کہ میں اُسے چھو سکوں۔ بالکونی میں ملاقات، جہاں گلی ایک کھائی کی طرح موجود تھی، کوئی ملاقات کی جگہ نہیں تھی۔ کیا میں اُسے چیاں والے بنگلے میں لے جاؤں جہاں لوئر چناب کینال کا پانی، کناروں سے ٹکراتے ہوئے، ترِل ترِل کرتے بہتا ہے اور جہاں گھنے درخت سارے پر سایہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور تو ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں میں اُسے لے جاتا یا اگر تھی تو میرے علم میں نہیں تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر میری بالکونی میں نہیں آ سکتی تھی اور میں بھی ٹارزن کی طرح بیل کی کسی مضبوط مگر لچک دار شاخ کو پکڑ کر گلی پار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری کیا تھی؟ محبوبہ یا دوست یا شناسا سا؟ ہمارے درمیان میں ابھی تک وقت نے کوئی کھائی نہیں کھودی تھی۔

میرے لیے وہ ایک سہانا موسم تھی، برسات کا وہ موسم جس میں بارش ایک خوش گواری کو اپنے

ساتھ لاتی ہے اور آخری قطرے کے ساتھ ہی حبس اُس خوش گوار موسم کو ناگوار بنا دیتا ہے۔ اُس سے ملاقات تو ایک خوشی کی بات تھی لیکن اُس خوشی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ملاقات کے دوران میں کسی وقت اُداسی در آتی تھی کہ اِس ملاقات نے کسی بھی وقت ختم ہو جانا ہے۔ میرا زیادہ وقت آرام کرسی پر نیم دراز، نیم خوابیدہ اور نیم ہوش میں گزرتا۔ لگتا کہ کسی نے مجھے جادو کر کے کمرے کے اندر قید کر دیا تھا۔ میں کرسی پر نیم دراز اندھیرا پھیلنے کے انتظار میں اُس کا انتظار کیا کرتا کہ اُنہیں بے رنگ سی شاخوں میں سے مجھے سیٹی سنائی دی۔ وہ بیل کے نیچے کھڑی مجھے بلا رہی تھی۔ کیا میں اُس کے بلاوے کو نظر انداز کر دوں؟ محبت میں انکار ہی اقرار سمجھا جاتا ہے۔ مجھے پالتو کتا یاد آ گیا جو سیٹی کی آواز سنتے ہی بھاگ کر مالک کے پاس چلا جاتا ہے۔ میں سیٹی کی آواز پر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں اُٹھ کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا اور میں نے اپنے حصے کی سیٹی نہیں بجائی۔ کیا مجھے سیٹی بجانا چاہیے تھی؟

میں تیزی نا دکھانے کے لیے اپنی طرف سے آہستہ سے لیکن اصل میں تیزی کے ساتھ اُٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی، ہمیشہ کی طرح۔ مجھے اُس کی مسکراہٹ میں معمول کی تازگی نظر نہیں آئی، ایک تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ ہم خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، گلی ہمارے درمیان میں ایک رکاوٹ تھی، ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، چھو نہیں سکتے تھے۔ ہمارے چہرے سنجیدہ، شاید افسردہ تھے۔ اِس طرح خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھے جانے میں ایک سکون بھی تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی خاموش بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی، مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا۔ وہ خاموش رہی:

کیا بات ہے؟'' مجھے اپنی آواز میں ماندگی کا احساس ہوا۔

''کچھ نہیں !''

''تھکی ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟''

''تھکاوٹ نہیں، تنہائی ہے۔'' اُس نے ایک طرح بشاشت سے کہا۔

''تمھارے گھر میں تو ہر وقت شور رہتا ہے۔ ایسے ہنگاموں میں تنہا کیسے ہو سکتی ہو۔''

''مجھے تم نے تنہا کر دیا ہے!'' مجھے ایک گہری طمانیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن میں نے چہرے پر سنجیدگی ہی رکھی یا ایسا ہی تاثر دینے کی کوشش کی۔ میں جانتا تھا کہ بعض اوقات پتا دیے

بغیر تاثرات اصل سوچ کی چغلی کھا جاتے ہیں۔ میری طرح اُسے بھی لائبریوں میں جانے کی ضرورت تھی؟ اُسے بھی گانے سننے چاہئیں؟

''تم سب کے ساتھ گھل مل کے رہ رہی ہو۔ تنہا تو میں ہوں جو یہاں تمھارا انتظار کرتا رہتا ہوں۔'' میرے لہجے میں شکایت تھی۔

''تنہائی کئی قسم کی ہوتی ہے۔'' پھر وہ خاموش ہو گئی، مجھے لگا کہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہے۔ ''ایک وہ تنہائی جس میں سے تم گزر رہے ہو، ایک وہ جس میں میں مبتلا ہوں اور ایک وہ جو انسان خود پیدا کرتا ہے۔'' اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ مجھے لگا کہ وہ کسی اُلجھن میں ہے۔ میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ''میری تنہائی کی وجہ یہ ہے۔'' اُس نے گلی کی طرف اشارہ کیا جو ہم دونوں کو جدا کیے ہوئے تھی۔ ''میں تمھارے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں۔ جی کرتا ہے کہ گھنٹوں باتیں کروں۔ بولتی جاؤں اُس پرندے کی طرح جو تھکے بغیر اُڑتے ہی چلا جاتا ہے۔ کیا کوئی ایسا پرندہ ہوتا ہے جو اِس طرح اُڑتا ہی جائے؟''

''ہاں! ہوتے ہیں ایسے پرندے جو اُڑتے ہی جاتے ہیں اور پھر گر کر مر جاتے ہیں۔''

''مرتے کیوں ہیں وہ؟ دم لے لیا کریں !'' اُس نے تشویش سے پوچھا۔ مجھے اُس کا یہ معصوم سا تجسس پسند آیا۔ ہم جب چھوٹے تھے اور میرے بھائی جو مجھے عقل کل سمجھتے تھے، ایسے سوال کیا کرتے تھے۔ میں جواب نا جانتے ہوئے بھی ایسے اعتماد کے ساتھ ایک طویل جواب دیتا کہ اُن کے چہروں پر ثبت مرعوبیت مجھے مطمئن کر دیتی۔

''ایسے پرندے کسی طرح بھٹک کر سمندروں کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں اور پھر خشکی کی تلاش میں اُڑتے ہوئے اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔'' مجھے صحن میں اپنے سامنے کھڑے بھائی یاد آ گئے۔

''میں بھی شاید سمندروں کی وسعتوں میں کھو گئی ہوں۔'' اُس نے ایک آہ بھری۔ ''مجھے بھی شاید خشکی کی تلاش ہے۔ میں بھی شاید پرواز کرتے کرتے ہی گر کے مر جاؤں۔'' اُس کے لہجے کی شدت سے میں گھبرا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ گلی پھلانگ کر اِس طرف آ جائے گی۔

''ایسی باتیں نا سوچتے اور نا کہتے ہیں۔'' میں بچپن سے بڑوں کی محفل میں یہ فقرہ سنتے آیا تھا اور آج اِسے کہتے ہوئے میں نے خود کو بزرگ اور دانا محسوس کیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جب کسی کی

مایوسی میں ایسی کیفیت ہو جیسی نوید کی تھی تو اُس سے باتیں ہی کروائے جانا چاہیے۔ جس بوجھ تلے وہ دبی ہوئی تھی میں اُس بوجھ کو کم کرنا چاہتا تھا۔

''تم سارا دن کیا کرتی ہو؟'' میں نے اپنی سوچ کو آگے بڑھایا۔

''کچھ نہیں۔'' اُس نے بے دلی سے جواب دیا۔

''یعنی کچھ بھی نہیں؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! کچھ بھی نہیں۔''

''گھر کے کام کون کرتا ہے؟''

''والدہ!''

''اور تم؟''

''کچھ بھی نہیں!''

میرے اندر اب ایک تجسس وجود پانے لگا تھا۔ ''کیوں؟''

''میرے گھر میں تعلیم نہیں اور میں پہلا فرد ہوں جو سکول گیا ہے۔''

''اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے گھر میں سب تعلیم یافتہ ہیں۔'' میں نے بات جاری رکھنے کے لیے کہا۔

''ہیں! سچ؟'' اُس نے تعجب سے تقریباً ہلکی سی چیخ لگائی۔

''ہاں! ہر فرد!''

''تمھاری..... تمھاری.....''

''ہاں! اماں جان بھی۔'' میں نے اُس کی مشکل حل کر دی۔

''تم اُنھیں اماں جان کہتے ہو؟'' اُس کی آواز میں اشتیاق اور دل چسپی تھے۔

''ہاں! تم کیا کہتی ہو؟''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں اندھیرے میں اُسے سوچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن انتظار میں تھا کہ وہ بولے اور مجھے خاموشی کی وجہ سمجھ آئے۔

''ہم پہلے بی بی جی کہتے تھے لیکن مجھے یہ کچھ عجب سا لگتا۔ میری ہر دوست کی ماں امی تھی اور

میں اُن کے سامنے اُنھیں امی ہی کہتی اور آہستہ آہستہ بی بی جی سے امی جان بن گئیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہلکا سا ہنسی۔ مجھے اُس کی ہنسی میں ندامت کا احساس ہوا۔

''ہمارے ہاں تو ہر ماں کو اماں جان ہی کہا جاتا ہے۔'' میں نے اُسے بتایا۔ ''میرے چچازاد بھی اپنی ماؤں کو اماں جان ہی کہتے ہیں۔ ہم ایک طرح سے روایت پسند ہیں۔ ہمارے ہاں باپوں کو ابا کہتے ہیں۔'' مجھے محسوس ہوا کہ جس طرح کے بوجھ تلے نوید دبی ہوئی تھی، میں بھی اُسی قسم کے کسی بوجھ تلے تھا۔ باتیں کرتے ہوئے مجھے اپنے اندر دبے ہوئے غبار میں کمی ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔ میں خود بھی باتیں کرتے چلے جانا چاہتا تھا۔ ''ہمارے دادا جو روایت قائم کر گئے ہم اُسی پر چل رہے ہیں۔'' میں اُس کی رائے کے لیے رکا۔

''صرف ابا ہی کہتے ہو؟'' نوید نے پریشانی اور حیرت سے پوچھا۔ ''ہم تو اپنے باپ کو خالی ابا کہنے کا سوچ ہی نہیں سکتے۔''

''کیوں؟'' اِس مرتبہ حیران ہونے کی میری باری تھی۔

''ابا جی یا ابا جان زیادہ مناسب ہے۔ اِس سے باپ کے لیے عزت کا اظہار ہوتا ہے۔''

''جی یا جان کہنے سے کیا عزت زیادہ ہو جاتی ہے؟ میرے کچھ جاننے والے اپنے والدین سے گستاخی کرتے ہیں، یقیناً اُنھیں ابا جی یا امی جان کہنا چاہیے۔'' میں نے قدرے سختی سے کہا۔

''جب تمھاری امی جان کام کر رہی ہوتی ہیں تو اُس وقت تم کیا کر رہی ہوتی ہو؟''

''وہ چاہتی ہیں کہ میں پڑھوں۔ میں کتاب لیے بیٹھی اوپر آنے کا سوچتی رہتی ہوں۔ اور اُن کا خیال ہے کہ میں پڑھ رہی ہوں۔'' وہ تھوڑا سا ہنسی اور پھر ایک آہ بھی بھری۔ مجھے آہ کی سمجھ نہیں آئی۔

''ناول پڑھتی ہو؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''میرے گھر میں ناول اور فلم کی ممانعت ہے۔''

''کسی کو کیا معلوم کہ کیا پڑھ رہی ہو؟'' میں نے اُس کا خوف دور کرنے کے لیے اُسے حوصلہ دیا۔

''پھر بھی کسی نا کسی کو تو پتا چل ہی جائے گا۔'' نوید کا دفاع کمزور تھا۔

''ناول کو کسی کتاب کے اوپر رکھ کے پڑھتے رہنا۔''نوید نے جواب نہیں دیا، میں اُس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے لیکن یہ طریقہ محفوظ ہوگا ؟''وہ ہتھیار پھینک چکی تھی۔

''ہاں !میں بھی ایسے ہی پڑھتا ہوں جب کہ میرے گھر میں ہر کوئی ناول اور کورس کی کتاب کو پہچانتا ہے۔''میں نے وضاحت کی۔

''کیسے دوگے؟''میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔

''یہاں سے اُس طرف پھینک دوں گا۔''میں نے اِس مسئلے کو جتنا آسان بنانا ممکن تھا، بنایا۔

''اگر مجھ تک نا پہنچا اور بیل میں پھنس گیا؟''نوید کی آواز میں اچانک خوف آ گیا تھا۔

میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔واقعی اگر کتاب بیل میں پھنس گئی تو نوید کیسے نکالے گی اور کیسے وضاحت کر سکے گی کہ کتاب کس کی تھی اور وہاں کیسے پہنچ گئی۔

''ایک حل ہے!''

''کیا ؟''مجھے کچھ اُمید نظر آئی۔

''کل تانگے میں پاس سے گزرتے ہوئے پکڑا جانا۔بہت آہستہ سے پاس سے گزرنا اور میں ہاتھ بڑھاؤں گی اور تم اُس میں کتاب رکھ دینا۔''یہ آسان سا کام اتنا آسان نہیں تھا۔نوید نے ایک ہجوم کی موجودگی میں میرے ہاتھ میں رقعہ تھما دیا تھا اور میرا اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر کتاب رکھ دینا ایک مختلف صورتِ حال تھی۔میں اپنا خوف نوید پر ظاہر بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے!''

سردی نے ہمیں کمروں میں بند کر دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نوید مجھے دوپہر کو ملے۔ میں اُسے تانگے میں بیٹھتے ہوئے تو دیکھتا تھا لیکن اُسے کہہ نہیں سکتا تھا کہ مجھے اب دوپہر کو ملا کرے۔ مجھے وہ شدت سے یاد آنے لگی تھی، اتنی شدت سے کہ میں گھر کے ضروری کام بھی بھولنے لگا اور میری سگریٹ نوشی میں اضافہ ہو گیا۔ میں اب رات کو کمرے میں بھی دو یا تین کش لگا کے سگریٹ بجھا دیتا ورنہ پہلے میں کمرے میں سگریٹ نہیں پیا کرتا تھا، اماں جان کے خوف سے۔ ایک رات معمول کے دو کش لینے کے لیے سگریٹ سلگا کر نیم دراز تھا کہ میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ تب کھلی جب انگلی جلی۔ مجھے جلنے کے درد سے زیادہ سگریٹ کے ضائع ہونے کا افسوس تھا۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے ہم لوگ تو ٹھگ بن گئے تھے۔ خریداری میں سے ہمیشہ کچھ پیسے بچاتے تاکہ سگریٹ خرید سکیں اور سگریٹ کا ایک کش بھی ضائع نا ہونے دیتے تھے۔

نوید کو میں ہر صبح دیکھتا تو ایک تازگی کا احساس ہوتا۔ وہ مجھے پچھلے دن سے بھی زیادہ تازہ، صحت مند اور خوب صورت لگتی۔ اُس کا رنگ صاف اور ہونٹ مزید سرخ ہوتے اور اُن ہونٹوں کا رس مجھے بے چین کر دیتا۔ میں اُسے اپنے پاس بٹھا کر اُسے چھونا چاہتا تھا اور اُن ہونٹوں کا رس چکھنا چاہتا تھا۔ کیا وہ بھی ایسے سوچتی تھی؟ مجھے ایسے سوال بے چین کر دیتے۔ چھٹی والے ایک دن میں صبح جلد اُٹھ گیا اور بائیسکل پر چیاں والے بنگہ کی طرف چل پڑا۔ شروع میں ٹھنڈ تو لگی لیکن نہر تک پہنچتے پہنچتے میرا جسم گرم ہو گیا تھا۔ ایمن آباد تک مجھے پسینہ آنا شروع ہو گیا اور میری رفتار بھی کچھ تیز ہو گئی۔ چیاں والا بنگہ زیادہ دور تو نہیں تھا اور مجھے جلدی بھی نہیں تھی۔ میں نے رفتار کم کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ نوید میرے

ساتھ ہو اور میں اُسے اپنے آگے بٹھاؤں اور وہ سنگترے چھیل کر ایک ایک قاش مجھے دیتی جائے اور میں آدھی اُسے کھلاتا جاؤں۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ میں نے ایمن آباد سے سنگترے خریدے اور ساتھ کالے نمک کی کافی بڑی پڑیا لی۔

سنگترے میرا پسندیدہ پھل تھا۔ مجھے یہی افسوس رہتا کہ یہ گرمیوں میں حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ یہ سنگترے گوجرانوالہ کے تھے اور ناگپور کے سنگتروں سے مختلف۔

میں جب بنگلے کی طرف جانے والے پہیے پر مڑا تو پسینے میں نہا چکا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ جب بائیسکل سے اُترا تو ٹھنڈ لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ پہیے پر گیلوں کی وجہ سے ایک ہی رفتار سے چلنا مشکل تھا لیکن فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے کچھ حوصلہ بھی ہوا۔ میں نے بائیسکل کو گیلوں کے درمیان والی جگہ پر چلاتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو تھوڑا سا آرام دینے کی کوشش کی۔ میں جب ڈاک بنگلے میں پہنچا تو پسینے میں شرابور ہونے کے باوجود تھکا ہوا نہیں تھا۔ میں وہاں کچھ دیر آرام سے بیٹھ کر نوید کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کے مشورے کے مطابق اُسے تانگے میں ناول تھما دیا تھا۔ اُس کی طرف ہاتھ بڑھانا مجھے ہاتھ کٹوانے کے مترادف لگا تھا۔ میں کتاب تھماتے ہوئے کتاب سے بھی خائف تھا۔ میں نے اُسے ناول دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے بہت سوچا تھا! کیا میں اُسے سماجی حقیقتوں پر مبنی کوئی ناول دوں یا کوئی رومان پر مبنی کہانی والا ناول دوں؟ کیا میں ایسا ناول دوں جو فطرت کے قریب ہو یا ایسا ناول جو جدید رجحانات کا عکاس ہو؟ میں کچھ فیصلہ نا کر سکا تو وہی وہانوی کا ایک ناول اُسے تھما دیا۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں وسیع لان کے ایک کونے میں نصب کیے بنچ پر بیٹھا ہوا تھا جو دھوپ میں نہایا ہوا تھا اور جس کے پاس ہی گلابوں کی ایک کیاری تھی جس میں سرخ گلاب کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ سنگترے بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ ناول لینے کے بعد ابھی تک نوید نے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں ہر شام، اندھیرا گہرا ہونے تک، کمرے کا دروازہ کھلا رکھے، سیٹی کے انتظار میں، کرسی پر نیم دراز رہتا لیکن مجھے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس نے ابھی تک ناول پڑھا ہی نا ہو! کیا میں چاہتا تھا کہ وہ اُس ناول کو پڑھے؟ اگر میں نا چاہتا تو اتنا خطرہ لے کر اُسے پڑھنے کے لیے دیتا ہی نا! میں نے اُسے دیا ہی اِس لیے تھا کہ وہ پڑھے اور اگر اُس نے پڑھ لیا تو میں خائف کیوں تھا؟ اُس کتاب میں مرد اور عورت کے جنسی اعضا کا عمل تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ کیا وہ اعضا کسی اور عمل کے لیے لگائے تھے؟ میں اُس کا سامنا کرنے سے

خائف کیوں تھا؟ وہ پوچھ سکتی تھی کہ میں نے اُسے وہ کتاب پڑھنے کو کیوں دی؟ کیا میں کوئی احساس ندامت اُٹھائے ہوئے پھرتا رہا تھا؟ مجھے ٹھنڈ کا احساس ہوا تو میں نے ایک جھرجھری لی۔ میری آنکھ کھلی تو میں سائے میں بیٹھا تھا اور پورا لان ایک ہلکی سی خنکی کی لپیٹ میں تھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی اور سائے مشرق کی طرف پھیل رہے تھے۔ میں نے دھوپ میں بیٹھ کے کھانے کے لیے سنگترے خریدے تھے لیکن خنکی کی وجہ سے کھائے نہیں۔ میں یہاں کچھ سوچنے کے لیے آیا تھا اور شاید تھکاوٹ یا دھوپ کی حدت نے مجھے نیند کے پنگھوڑے میں ڈال دیا تھا۔ میں شاید وہی وہانوی کا ناول اُسے دے کر خوف زدہ ہو گیا تھا اور اُس کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہاں کوئی حل نکالنے آیا تھا یا اُس سے چھپ کر یہاں بھاگ آیا تھا؟

مجھے ہلکی ہلکی ٹھنڈ لگنا شروع ہو گئی تھی اور میں واپس چل پڑا۔ ہمیشہ کی طرح میری رفتار کم تھی، میں بائیسکل تیز چلانے میں یقین نہیں رکھتا تھا، مجھے یہ ایسی سواری لگتی جس پر تیز سفر کرنا اُس کی اہمیت کم کرتا تھا، ہر پیڈل پر ایک لطف لینے میں یقین رکھتا تھا چناں چہ تھوڑا سا آگے کو جھکا میں آہستہ آہستہ، ہمیشہ کی طرح چلتا رہا اور ہر سواری مجھے پیچھے چھوڑتی رہی۔ میں جب گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ ہمارے گھر میں، گرمیاں ہوں یا سردیاں، چائے چار بجے پی جاتی تھی۔ اماں جان کا حکم تھا کہ جو اُس وقت وہاں موجود نا ہو وہ اُسے چائے بنا کر نہیں دیں گی اور یہ ابا پر بھی لاگو تھا؛ اُس صورت میں وہ بھی اپنی چائے خود بناتے۔ مجھے چائے کی حاجت تھی اور میں چائے بنا کے اپنا پیالہ لیے اوپر چلا گیا۔ میں چائے پی رہا تھا کہ مجھے سیٹی سنائی دی۔ مجھے پہلے یقین نا آیا اور یقین کرنے کے لیے میں نے وہیں سے سیٹی بجائی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کی کہ سیٹی بجائی گئی ہو۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ میں دعا کرنے میں یقین نہیں رکھتا تھا لیکن نوید کی موجودگی کے لیے دوا گو تھا۔ اُسی وقت مجھے قدرے بلند سیٹی سنائی دی۔ میرے ہونٹوں پر اُمید سے بھری ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیے، اعتماد اور کم اعتمادی کو جدا کرتی لکیر پر چلتے ہوئے بالکونی میں گیا تو وہ مجھے نظر آئی۔ ہمیشہ کی طرح اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جو میرے تحفظات کو ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔

''کیسی ہو؟ ''میں نے اپنی آواز میں سے پریشانی اور کھچاؤ کو دور کرنے لیے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک نہیں لگ رہی ہوں؟'' اُس نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

''آواز سے تو لگ رہی ہو۔''

''اچھا جی ! کیا ویسے نہیں ہوں؟'' اُس کے قہقہے کے لیے بالکونی بہت چھوٹی تھی اور میں نے اُس قہقہے کو ہوائی لہروں پر رقص کرتے ہوئے پاس سے گزرتے وقت پکڑنے کی کوشش کی تا کہ کوئی اور نا سن سکے۔ ''ایک بات بتاؤ؟'' مجھے وہ قطعاً سنجیدہ نہیں لگی لیکن میرے جسم کے اندر غیر لچک دار قسم کا کھچاؤ آ گیا۔ میرے ذہن میں ناول میں درج ہم بستری کے مناظر گھوم گئے۔ میں اپنے ذہن میں صفائی کے مناسب فقرے ترتیب دینے لگا۔ وہ پھر ہنسی۔

''پوچھو !'' میں نے اپنے خوف کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم سگریٹ پیتے ہو؟'' اُس کی آواز میں پریشانی تھی۔ میں کسی حد تک آرام سے ہو گیا کہ ناول ہمارے درمیان میں حائل نہیں ہوا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ نوید کو میرے سگریٹ پینے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ میں اُسے کیا بتاتا؟

''کیوں ؟'' میں نے حیران ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں تو سوال ہے جی ! میں نے جواب مانگا تھا۔ کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟'' میں اُس کی بات کی شدت سے گھبرا اور کچھ ڈر سا گیا۔ کیا وہ کسی وقت میرے گھر والوں کو بتا سکتی ہے؟ مستقبل قریب میں اِس کا امکان تو نہیں تھا لیکن اگر وہ مجھے لاجواب کر سکتی ہے تو کسی وقت اپنے تئیں کوئی اچھا کام کرتے ہوئے اماں جان کو بتا بھی سکتی تھی۔ اُس کے لہجے اور انداز کے جواب میں انکار ممکن نہیں لگا۔

''ہاں!'' میں نے اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پیتے ہو تو پیتے ہو! اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' اُس نے ایک حتمی سے انداز میں کہا۔

''چوری پیتا ہوں۔'' میں نے ایسے اعتراف کیا جیسے بچپن میں چھوٹے بھائی کی ٹافیاں چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے پر اماں جان کے سامنے اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہنسی تو مجھے لگا کہ میرا انداق اُڑا رہی ہے۔ میں نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے دیکھ تو نہیں سکتی تھی لیکن شاید چند لمحوں کی خاموشی میں میرا غصہ اُس تک پہنچ گیا تھا یا شاید وہ جان گئی تھی کہ اُس نے غلط بات کی تھی۔

''میرا صرف یہ مطلب تھا،'' اب اُس کے لہجے میں مصالحت تھی۔ ''چوری کیوں پیتے ہو؟'' وہ

رکی، میرا قہقہہ لگانے کو دل کیا۔ اگر اماں جان کو پتا چل گیا تو وہ اور کچھ نہیں تو مجھے گھر سے ضرور نکال دیں گی۔

''ہمارے ہاں میری عمر کے لوگوں کا تمبا کو پینا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ایک غیر مہذب فعل ہے۔'' میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اماں جان کے مزاج کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر سوچا جائے تو وہ ابا کو بھی سگریٹ پینے کے موقعوں پر گھر میں نا رہنے دیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابا گھر میں چھالیہ کھاتے ہوں اور باہر اُن کی سگریٹ نوشی جاری ہو۔

''میرے ابا جی تو اپنے باپ کے سامنے سگریٹ پیتے تھے۔ اُن کی ماں بھی سگریٹ پیتی تھی اور.....'' اور وہ ایک دم قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ مجھے کچھ عجیب سا بھی لگا۔ ہماری اِن ملاقاتوں میں یہ پہلی مرتبہ تھا کہ مجھے اُس کا قہقہہ ناگوار لگا ہو۔ ''اور بعض اوقات وہ دونوں اکٹھے سگریٹ پی لیتے تھے۔'' اب مجھے اُس کے قہقہے میں ایک نزاکت کا احساس ہوا۔

''ہم بھی نا اکٹھے سگریٹ پیا کریں؟ ایک سوٹا تمھارا اور ایک میرا!'' میں مسکرائے بنا نا رہ سکا کہ کمرے میں سگریٹ نوشی شمر اور میرے درمیان میں غیر طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔

''کیا یہ ممکن ہوگا؟ تم تو کھانستے کھانستے مر جاؤ گی۔'' پھر تھوڑا سوچ کر میں نے کہا، ''مجھے تو گھر سے نکال دیا جائے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے بات جاری رکھی۔ وہ بھی ہلکا سا ہنسی۔ اُس کی ہنسی میں عدم دلچسپی تھی۔ ''سنگترے کھاؤ گی؟'' مجھے ایک دم ایمن آباد میں خریدے ہوئے سنگترے یاد آ گئے۔

''اگر کہنیا لعل کے باغ کے ہوئے تو ضرور کھاؤں گی۔'' میں کمرے سے سنگترے لے آیا۔ ناول کی طرح مجھے سنگترے اُس تک پہچانا ایک مرحلہ لگا۔ اندھیرے میں شاید میری اُلجھن اُس تک سفر کر گئی تھی۔

''بیل کے اوپر سے ایک سنگترہ پھینک دو، بہت آہستہ نا پھینکنا کہ شاخوں میں اٹک کر رہ جائے اور اتنا زور سے بھی نہیں کہ پچھلے گھر میں چلا جائے۔'' میں قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ مجھے اُس کی بات خاصی دل چسپ لگی۔

''ہنسنے کی کیا وجہ ہے ؟'' اُس کی آواز میں برہمی تھی۔

''یہ ایسے ہی کہ کتے کو کہا جائے کہ وہ بھونکے ضرور لیکن آواز نا آئے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ مجھے اُس کی ہنسی میں ایک نرم سی اُداسی محسوس ہوئی۔ ''میں یہ سنگترے تمھارے ساتھ کھانا چاہتی تھی۔''

''میرے ساتھ ہی کھا رہی ہو!'' میں نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''سوچو کہ میں تمھارے پاس ہوں اور تم چھیلنے کے بعد آدھی پھانک خود کھا کے آدھی مجھے دے رہی ہو۔''

''میں ہمیشہ کالا نمک لگا کر کھاتی ہوں۔'' اُس نے دل چسپی سے جواب دیا۔

''میں کالا نمک بھی لایا ہوں۔''

''ہیں! تمھیں معلوم تھا؟' اُس نے معصومانہ جوش کے ساتھ پوچھا۔

''مجھے اندازہ تھا۔'' میں نے پیار سے کہا۔

''تم کتنے اچھے ہو۔'' اُس نے اُسی معصومیت سے کہا۔

میں کچھ شرمندہ سا ہوا اور خاموش رہا۔ مجھے اُس کی معصومیت پر پیار آیا۔ شام، رات میں ڈھل گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کو نظر آئے بغیر چہروں کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا، وہ سوچ رہی ہے کہ کیا کیا بات کرے۔ میں اُس کے انتظار میں خاموش تھا۔ مجھے تھوڑی ٹھنڈ لگنا شروع ہو گئی تھی اور مجھے اماں جان کا بھی خوف تھا کہ وہ کھانے کے لیے بلانے نا آجائیں۔ وہ جب بھی اوپر آتیں تو ایک مرتبہ سارے کا چکر ضرور لگاتیں اور بیل کی طرف اشارہ کر کے ہمیشہ کہتیں: یہ جنگل اِن جنگلیوں کو پتا نہیں کیوں پسند ہے؟

''دیکھو!'' نوید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''مجھے ..... مجھے اُس طرح کا اور ناول لا دو گے؟'' مجھے ایسے لگا کہ کسی جن نے اُٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دیا ہے۔ مجھے اپنا دل تیزی کے ساتھ دھڑکتے ہوئے محسوس ہوا، لگا کہ چھاتی سے باہر آجائے گا۔ میں خوف زدہ تھا کہ وہ کہیں ناراض نا ہو گئی ہو اور کہاں اُسی طرح کے ناول کی ایک اور فرمائش!

''اگر کسی نے پڑھ لیا؟'' میں نے اپنی آواز میں لاتعلقی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کون پڑھے گا؟'' وہ ہنسی، ''میرے گھر میں سب ان پڑھ ہیں۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ پڑھو، اور کچھ نہیں تو یہاں کھڑے ہو کر۔ وہ پڑھے اور میں سنوں! شاید یہ ابھی قبل از وقت تھا۔

''خوش قسمت ہو!''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرے گھر میں سب پڑھے ہوئے ہیں۔مجھے ایسی کتابوں کو چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔''

''ایک بات تو بتاؤ ؟''

''ہاں!''میں تھوڑا خائف ہو گیا۔

''کیا ایسے ہو سکتا ہے؟''مجھے پھر کسی جن نے اُٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دیا۔پیشتر اِس کے کہ میں جواب دوں،بیل میں سرسراہٹ ہوئی اور وہ غائب ہو گئی۔سنگترے میرے ہاتھ میں تھے۔میں نے ،جیسے کہ اُس نے کہا تھا،ایک سنگترہ اُس طرف پھینک دیا۔کالا نمک پھینکنا ممکن نہیں تھا۔میں کچھ دیر وہاں کھڑا اُس کی آخری باتوں پر غور کرتا رہا۔کیا مجھے دوسرا ناول لا کر دینا چاہیے؟جہاں سے میں یہ والا لایا تھا وہاں دو اور ناول بھی تھے۔کیا میں اُسے گمراہی کی طرف دھکیل رہا تھا؟کیا کسی کو گمراہ کیا جا سکتا ہے ؟میرے خیال میں اُسی کو گمراہ کیا جا سکتا ہے جو گمراہ ہونا چاہے؟اِسی کش مکش میں مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اُسے دوسرا ناول بھی لا دوں گا لیکن فوراً نہیں۔وہ شاید تین یا چار دنوں میں سارے ناول پڑھ لے اور اُس کے مزید تقاضے کے جواب میں شاید مجھے خود ہی لکھنا پڑے۔کیا میں لکھ سکوں گا؟

ایک دن ابا نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اماں جان کو بلند آواز میں پکارا: ''بیگم! سب کو صحن میں اکٹھا کرو!'' اُن کی آواز اتنی بلند تھی کہ میں نے چھت پر بھی سن لی اور متجسس سا نیچے آ گیا۔ اماں جان اور میرے دونوں بھائی صحن میں حیران سے کھڑے ابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابا میرے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''میرا ایک خواب پورا ہو گیا!'' ابا کے چہرے پر خوشی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہم سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید اپنی خوشی کو بتائے بغیر ہم تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ میں بھی حیرت زدہ اور کچھ متجسس سا بھائیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میرے بھائی بے چین نظر آ رہے تھے، میں اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش میں تھا۔

''اب بتا بھی چکو! کیا اُلو بنائے رکھنا ہے ہمیں؟'' اماں جان نے رکھائی سے کہا۔

''کوئی تکا ؟'' اُنھوں نے ہمیں مخاطب کیا۔ ہم تینوں خاموشی سے اُنھیں دیکھتے رہے۔

''گھر کے مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا ہے۔'' اُنھوں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور نتھی کیے گئے چند کاغذات نکالے۔ ''یہ فیصلے کی نقل ہے۔'' اُنھوں نے وہ کاغذات سب کے سامنے لہرائے۔ مجھے اپنے کمرے کے چھننے اور نوید سے دور ہونے ہو جانے کا خوف جاتا رہا۔

''شکر ہے !'' اماں جان نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا، ''وکیلوں کی تنخواہ والے پیسے اب گھر کے خرچ کے لیے صرف ہوں گے۔''

''تم کبھی عقل کی بات نہیں کہو گی!'' ابا نے تلخی کے ساتھ کہا۔

''میری مشکل تم نہیں سمجھو گے کبھی!'' اماں جان نے رکھائی سے جواب دیا۔

''وصی!'' ابا نے مجھے مخاطب کیا۔

''جی ابا!''

''میں تمھیں پیسے دوں گا اور تم نے جالندھر والوں سے مٹھائی خرید کر میرے وکیل سید اظہر حسین زیدی صاحب کے گھر پہنچانی ہے۔ جالندھر والوں کی دکان ریل بازار میں ہے۔ زیدی صاحب کا گھر سول لائینز میں ہے۔ گوندلاں والا پھاٹک سے جب سول لائین میں جاؤ تو اُلٹے ہاتھ والی پہلی گلی میں مڑ جانا۔'' اب ابا کو میں کیا بتاتا کہ میں وہاں کتنی مرتبہ جا چکا ہوں۔ شبّر کی ہدایت کے مطابق میں چپ رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ راستہ جلد بتا دیں اور میں وہاں پہنچ کر سرکاری طور پر آزادی سے گپ لگا سکوں ورنہ اماں نے گھر سے نکلنے کا وقت یاد رکھا ہوتا ہے۔ ''اُس گلی میں چلتے جانا۔ اُلٹے ہاتھ والی چوتھی گلی کے ساتھ ہی پہلا گھر اُن کا ہے۔ دروازے کے اوپر اُڑی ہوئی رنگت والی اُن کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔'' ہم اِس تختی کے اُڑے ہوئے رنگوں کی وجہ سے شبّر کو مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ ''دروازے کے اوپر دائیں کونے میں گھنٹی کا بٹن ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانا مت۔ اُن کی ڈیوڑھی کا اندر والا دروازہ بند ہوتا ہے۔''

جب ابا اپنا جغرافیہ ختم کر چکے تو میں نے دل میں شکر ادا کیا۔

ابا نے مجھے کچھ پیسے دیے جو میں نے گنے بغیر جیب میں ڈال لیے، چار خانوں والا تہہ بند اُتار کر صبح والی پتلون قمیص پہنی اور اپنا بائیسکل لیے گھر سے چل پڑا۔ مٹھائی خریدنے سے پہلے میں شیش محل میں گیا کہ شاید وہاں شبّر میرے انتظار میں ہو۔ ہمارا یہ دستور تھا کہ اُس وقت اگر کوئی اُس طرف آتا تو شیش محل میں ایک نظر ضرور دیکھ لیتا۔ شبّر وہاں نہیں تھا۔ میں نے جالندھر والوں سے مٹھائی خریدی جس میں مجھے بیس روپے بچ گئے جن سے میں نے ریڈ اینڈ وہائیٹ کی آدھی ڈبیہ اور دو الائچی سپاری پان خریدے۔ کڑکی کے اُن دنوں میں بیس روپے ہمارے لیے ایک خزانہ تھا اور سگریٹوں کی آدھی ڈبیہ نا قابلِ بیان عیاشی۔ میں وہاں سے اپنی رفتار پر بائیسکل چلاتے، ابا کی ہدایت کے مطابق شبّر کے گھر پہنچا تو وہاں ہماری عمر کا ایک منحنی سا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ناخوشگوار سا تاثر پھیل گیا جو شبّر نے بھی محسوس کیا۔ وہ جب کھڑا ہوا تو اُس کے کاندھے تھوڑا اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے، گویا وہ کسی کھچاؤ میں تھا۔ اُس نے مصافحہ کیا تو اُس کے ہاتھ اتنے چھوٹے اور نرم تھے کہ میرا جی اُنھیں مسل دینے کو چاہا۔

''میرے دوست اسلم صاحب ہیں۔''شمّر نے تعارف کرایا۔''ہم آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے اِس لیے تعارف کی ضرورت نہیں۔''شمّر ہنسا،''اسلم صاحب اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے۔''

''یا اُن سے گھبراتے ہیں۔''میں نے اسلم کے چہرے پر آنے والے ناخوش گوار تاثر کے جواب میں چوٹ کی۔

''نہیں! نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔''وہ ہاتھ ملتے ہوئے شرمندہ سا ہنسا۔''دوستوں سے کیسا گھبرانا۔''

''شمّر صاحب! یہ مٹھائی ابا نے زیدی صاحب کے لیے بھیجی ہے۔''میں نے تھیلا اُسے تھماتے ہوئے کہا۔

''خیریت! خان صاحب شادی تو نہیں کر رہے؟''شمّر نے تھیلا پکڑتے اور ہنستے ہوئے پوچھا۔اسلم ہماری اِس گفتگو سے لاتعلق، اپنے ہی خیالوں میں گم تھا یا وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا۔

''کر چکے وہ!''وہ تھیلا لے کے اندر چلا گیا۔

''آپ کہاں پڑھتے ہیں؟''میں نے خاموش بیٹھے رہنے کے بجائے بات کرنا ضروری جانا۔

''نہیں۔میں ایک سکول میں پڑھاتا ہوں۔''اُس کا جواب مختصر اور کسی قسم کے تاثر سے خالی تھا۔شمّر پلیٹ میں برفی اور گلاب جامن لیے آ گیا۔

''مبارک ہو! تم لوگ صاحبِ حیثیت ہو گئے۔''شمّر نے ہنستے ہوئے کہا۔میں نے جواب دینے کے بجائے برفی کی ڈلی کھانے کو ترجیح دی۔''اسلم صاحب بوڑھوں والے افسانے لکھتے ہیں۔''میں نے اسلم کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جنھیں میں مسل دینا چاہتا تھا۔شمّر کے فقرے پر اسلم نے ایک مصنوعی سا قہقہہ لگایا اور ہاتھ ملنے لگا۔

''آپ کچھ لکھتے ہیں؟''اسلم نے شمّر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا، شاید وہ کوئی اشارہ کرنا چاہ رہا تھا جو میرے دونوں کی طرف دیکھنے کی وجہ سے نہیں ہو سکا۔

''جی ہاں!''

''کیا؟''اسلم تمام تر توجہ بن گیا۔

''اماں جان جو سودا منگوانا چاہتی ہیں وہ لکھ کر لے کے جاتا ہوں۔اگر کچھ بھول جاؤں تو

ڈانٹ پڑتی ہے۔''اسلم نے پھر وہی قہقہ لگایا۔میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہنستا ہی ایسے ہے۔

''وصی صاحب !اسلم صاحب ایک سٹڈی گروپ بنانا چاہتے ہیں جس میں ماؤ کی ریڈنگ کا مل کر مطالعہ کیا جائے اور ہم لوگ ایک دوسرے کی تحریروں پر تنقیدی رائے دیں۔''شتر نے کھچاؤ کو کم کرنے کے لیے گفتگو کا رُخ بدلا۔

''سٹڈی گروپ میں کون لوگ ہوں گے؟''میرا تجسس قدرتی امر تھا۔

''ہم تینوں۔''

''تحریریں تو صرف اسلم صاحب ہی پیش کریں گے۔ہم دونوں تو کچھ لکھتے ہی نہیں ہیں۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''شتر صاحب شاعری کرتے ہیں۔''اسلم نے مجھے اطلاع دی۔ میں کسی حد تک سکتے میں آ گیا۔

''میرے گھر میں ابا کے علاوہ سب شاعری کرتے ہیں چناں چہ میں بھی تک بندی کر لیتا ہوں۔''شتر نے کسی حد تک شرمندگی سے کہا جس کی وجہ اُس کا اپنی شاعری کے بارے میں مجھ سے چھپائے رکھنا تھا۔

''آپ بھی کچھ لکھیں۔''اسلم نے مجھے سوچ میں گم دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔اسلم صاحب کی طرح میں بھی افسانے لکھوں گا۔''میں نے وقفہ دیا، مسکرایا اور بات جاری رکھی، ''لیکن جوانوں والے۔''اسلم کا قہقہ اُس کے پہلے والے قہقہوں سے مختلف تھا۔

''بہت خوب۔یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔اب ہم اپنے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔''اسلم نے ہاتھ ملتے ہوئے جوش کے ساتھ کہا۔میں خاموش رہا۔ مجھے خود اپنے مشن کا ابھی تک علم نہیں تھا تو میں اُس کے مشن پر کیا رائے دیتا۔

''یہ سٹڈی گروپ خفیہ رہنا چاہیے۔''اسلم یک دم بزرگانہ لہجہ اختیار کر گیا۔'' حالات ابھی ساز گار نہیں کہ دوستوں کو ہمارے سٹڈی سرکل کے بارے میں علم ہو۔ جب مناسب وقت آیا تو ہم اِسے وسیع کر لیں گے۔ابھی نہیں۔''

مجھے اچانک یاد آیا کہ میری جیب میں آدھی ڈبیہ ریڈ اینڈ وہائیٹ کی پڑی ہے اور پان بھی۔

مجھے اچانک سگریٹ کی شدید طلب ہونے لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک سگریٹ نکالا۔ شبّر مجھے ایسا کرتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ اُسے سلگانے کے لیے دیا تو اُس نے ہنستے ہوئے کہا: ''چوتیا تو مت بنائیں۔ ڈبیہ جیب میں صاف نظر آ رہی ہے۔''

میں نے ظاہر کیا کہ میری چوری پکڑی گئی ہے اور کھسیانہ سا ہو کے ڈبیہ نکال کے ایک سگریٹ خود لیا اور اسلم کو پیش کیا۔ اسلم نے سگریٹ لے کر ہونٹوں میں دبا لیا، سلگایا نہیں جب کہ شبّر اور میں نے لمبے لمبے کش لے کر ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پھر اُس نے مٹھائی والی خالی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا: ''یہ وہاں سے ہے؟''

''ہاں!'' میں نے ایک لمبا کش لیا، ''یہ وہاں سے ہے۔'' اور ہم دونوں نے اپنے اپنے انداز میں قہقہہ لگایا۔

اُسی وقت اسلم اُٹھ کھڑا ہوا۔ سگریٹ اُس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اُس نے بغیر کچھ کہے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور دونوں کندھے اوپر کی طرف کر کے باہر نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی میں نے پان نکالے اور ہم دونوں پان کھاتے ہوئے سگریٹ کا لطف لینے لگے!

ہمارے سندی گروپ کی پہلی بیٹھک آخری بھی تھی۔ اسلم نے "بوڑھا برگد" کے عنوان سے ایک طویل افسانہ سنایا جس کے متعلق مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ وہ اتنا طویل تھا کہ کم از کم میں سنتے ہوئے اُکتا گیا۔ اسلم کا افسانہ سننے سے پہلے ہم ریڈ بک کے پہلے باب کو باری باری پڑھ کر اُس پر اتنی تفصیلی گفتگو کر چکے تھے کہ افسانے پر بحث کے لیے کم از کم میرے اندر بھاپ ختم ہو گئی تھی۔ وہ افسانہ ضرور اچھا رہا ہوگا کیوں کہ اسلم کی تحریر میں ایک دل کشی ضرور تھی۔ شمر نے پانچ شعروں کی ایک غزل سنائی جس کی اصلاح اُس نے اُردو کے لیکچرار اور معمول کے شاعر ظہیر سے لی تھی۔ وہ ایک عشقیہ قسم کی غزل تھی جسے ایک طرح سے نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنے افسانے کے متعلق اتنا یاد ہے کہ میں نے منہ بننے کی کوشش کی تھی۔

اسلم کے ساتھ بعد میں مستقل ملاقات رہی۔ شمر کے ساتھ دوستی سورج غروب ہونے تک محدود تھی کیوں کہ اُسے رات کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی؛ اجازت تو مجھے بھی نہیں تھی لیکن میں ابا اور اماں جان کے اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد گھر سے نکل جاتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اماں جان گھر کے کام نمٹا کر ابا کے پاس چلی جاتیں اور وہ، اگر کوئی نہایت ضروری کام نہ آن پڑے، جس کی اُمید نہیں ہوتی تھی، صبح ہونے پر ہی کمرے سے نکلتے تھے۔ میں تب چار خانی دھوتی میں گھر سے نکلتا۔ اسلم ریلوے سٹیشن کے سامنے ٹیلی فون کے کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے، اَن جلا سگریٹ ہونٹوں میں لٹکائے، کندھے تھوڑا اوپر اُٹھائے، کھڑا ہوتا۔ میں اُس کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتا جو اُسے قطعاً پسند نہیں تھا۔ وہ میرے دھوتی میں آنے کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ مجھے اُس کے ساتھ پنجابی میں بات کرنا اچھا لگتا

تھااور اُسے میرے لہجے کی ناہمواری پر اعتراض رہتا۔ کسی نے کبھی میرے لہجے پر اعتراض نہیں کیا تھا سوائے اسلم کے اور اِس کی وجہ اُسے میرا اُردو بولنے والا ہونے کے بارے میں علم ہونا تھا۔

اسلم اُن دنوں دستوفیسکی پڑھ رہا تھا اور مجھے کئی مہینے اُس کے طرزِ تحریر پر پوری رات گفتگو سننا پڑتی ، میں نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ crime and punishment پڑھ چکا تھا۔ میں حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہیں کہیں فقرہ چست کرکے اُسے بھڑکا دیتا اور پھر ایک طویل لیکچر سننے کو مل جاتا۔ میں نے اسلم سے کبھی اُس کی افسانہ نگاری کے بارے میں بات نہیں کی تھی کہ مبادا مجھے سننا پڑ جائے کیوں کہ ''بوڑھا برگد'' سننے کے بعد میں اُس عمل میں سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

مجھے گھر آنے کے بعد نوید کی یاد ستاتی۔ میں اُس کے باریک ہونٹوں، چمکتی ہوئی آنکھوں اور قدرے اُبھری ہوئی گالوں کی ہڈیوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جب بھی وہ یاد آتی، میں اُس کے قہقہے اور جسم کے خطوط میں کھو جاتا۔ کیا مجھے صرف اُس کے جسم سے دلچسپی تھی؟ اِس سوال کا جواب میں گھنٹوں بیٹھا سوچتا رہتا یہاں تک کہ کرسی پر مجھے نیند آجاتی اور رات کے کسی پہر جب آنکھ کھلتی تو ایک غیر آرام دہ آسن میں لیٹے رہنے کی وجہ سے بدن میں درد ہوتا۔ وہ درد مجھے جگائے رکھتا اور میں نوید کے بارے میں سوچتا رہتا۔

نوشہرہ روڈ پر رہتے ہوئے میرا خاندان ایک عجیب قسم کی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ ہمارے اردگرد کے لوگ ہمیں اتنا پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم بھی انھیں پسند نا کرتے ہوں۔ ہمارے جیسے خاندانوں کا تعلق یا تو اُن علاقوں سے تھا جہاں سے ہم آئے تھے اور یا ہم سب کی کوشش رہتی کہ کراچی چلے جائیں۔ اماں جان نے ساڑھی پہننا تو چھوڑ دی تھی لیکن اُن کا ملنا جلنا کسی بھی پنجابی عورت کے ساتھ نہیں تھا۔ اس میں شاید زبان بھی ایک رکاوٹ ہو لیکن ابا کو ایسا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کچہری جاتے، منشیوں، محرروں اور دوسرے کئی اہل کاروں کے ساتھ اُن کا رابطہ رہتا تھا اور وہ ٹوٹی پھوٹی، اُردو زدہ پنجابی بول بھی لیتے تھے لیکن انھیں پنجابی بولنے والوں کے ساتھ ضرورت کے علاوہ کوئی ربط رکھنا پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیں بھی روکتے کہ ہم اپنی زبان اور لہجے کی حفاظت کریں۔ میں کسی حد تک اُن کے اِس نظریے کے خلاف بغاوت کر چکا تھا لیکن وہ مجھے اپنی تہذیب اور ثقافت کی برتری کے متعلق کسی نا کسی طرح بتاتے رہتے۔ ہمارا ملنا جلنا جعفری، کاظمی، بخاری زیدی وغیرہ اور چند ایک خان خاندانوں کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ مہینے میں ایک بار کسی نا کسی کے گھر اکٹھے ہوتے، وہاں مراد آباد، الہ آباد، احمد آباد اور لکھنو کے پکوان سجائے جاتے جنھیں کھاتے ہوئے پنجابی کھانوں اور کھانے والوں کی بسیار خوری کا مذاق اُڑایا جاتا۔ کھانے کے بعد دیر تک ایک بے تکا قسم کا مشاعرہ برپا ہوتا جس میں چند خواتین شاعرات ترنم کے ساتھ اپنی غزلیں سناتیں۔ ابا بھی کسی حد تک تنگ بندی ہی کرتے تھے کیوں کہ میں نے قیصر کو کبھی انھیں داد دیتے نہیں سنا تھا۔ قیصر کا اب گوجرانوالہ کے چند اچھے شعرا میں شمار ہونے لگا تھا اور اُس نے اپنے گھر میں کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ پنجابی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگا تھا۔

ہاشم احمد خان ایک ریٹائرڈ آفس سپرنٹنڈنٹ تھے اور اُن کی طلاق یافتہ بہن اُن کے ساتھ رہتی تھی جس کا نام عنبر تھا۔ عنبر تقریباً پینتیس برس کی دراز قد، دبلی لیکن بھری ہوئی چھاتیوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی ایک پرکشش عورت تھی۔ چوں کہ وہ ایک دبلی عورت تھی اس لیے بھری ہوئی چھاتیاں اُسے ایسا وقار دیتی تھیں کہ محفل میں نظر کسی طرف جاتی ہی نہیں تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں نے اُس کے چہرے کو حیرت کی تحریر بنا دیا تھا اور وہ جب مجھے دیکھتی تو ایسے لگتا کہ میرا چہرہ پڑھ رہی ہے۔ ایک کھانے اور مشاعرے کی محفل میں مَیں نے اُسے متواتر دیکھنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے میں ایک طرف ایسے ہو کے بیٹھ گیا کہ اپنے تئیں اُس کی نظر کی سیدھ میں نہیں تھا جب کہ وہ میری نظر کے احاطے میں تھی۔ میں سب کی نظر بچا کر اُسے متواتر دیکھے جا رہا تھا اور وہ میرے منصوبے سے بے خبر اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اُسے اس طرح دیکھنا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ کبھی کبھی اُس کے سانولے چہرے پر ایسی چمک آ جاتی کہ مجھے محسوس ہوتا کہ اُس کا روپ اُس کے وجود سے باہر نکل جائے گا۔ اُس کی نظر سب کے چہروں سے ہوتی ہوئی ابا پر رُک جاتی۔ ابا اُسے دیکھ تو نہیں رہے تھے لیکن جب اُس کی نظر ابا پر ٹکتی تو وہ بے چین سے ہو جاتے۔ کوئی برقی رو اُن دونوں کو ملائے ہوئے تھی کہ جیسے ہی عنبر کی نظر اُن پر آ کر رکتی، لگتا کہ ابا کو کوئی خیال نیند سے بیدار کر گیا ہے جس کی وجہ سے وہ سب کے چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتے اور مجھے اُن کے ہونٹوں پر ایک دزدیدہ سا تبسم نمودار ہوتا نظر آتا جو میرے لیے کسی طرح بھی حیرت ناک انکشاف سے کم نہیں تھا۔ مجھے پہلے تو حیرت ہوئی لیکن پھر میں ابا کی بے چینی سے لطف اُٹھانے لگا۔ مجھے بھی ایک طرح کی بے چینی تھی کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی یہ مشاہدہ نا کر رہا ہو! میں اب عنبر کے ساتھ باقی لوگوں کا، خاص کر اماں جان کا، معائنہ کرنے لگا لیکن مجھے معمول سے ہٹا ہوا کوئی اشارہ یا حرکت نظر نہیں آئی۔ میں کسی حد تک مطمئن عنبر اور ابا کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اُن دونوں کے بیچ میں کوئی اشارہ تو نہیں ہوا تھا اور نا ہی ایسی کوئی حرکت جو دونوں کے درمیان میں کسی قسم کے تعلق کی چغلی کھائے لیکن پھر بھی وہاں کچھ ایسا ضرور تھا جس کی پردہ داری تھی اور دونوں کے درمیان میں وہ پردہ کم از کم میرے سامنے سب راز افشاں کر گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں عنبر کے چہرے کا متواتر جائزہ لے رہا تھا تو اُس نے اچانک میری جانب دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں تو مجھے وہاں حیرت کے بجائے ایک طرح کی اُلجھن نظر آئی، جیسے وہ کچھ طے کرنے کے عمل میں ہو اور پھر اُس کی آنکھوں سے حیرت ٹپکنے لگی؛ اُس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی اور

اُس نے شرما کے سر جھکالیا۔

اُس رات دیر تک میں اِس اجنبی اور ناموافق قسم کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں شاید سو بھی گیا ہوں گا لیکن وہ نیند غالباً جاگنے کا حصہ ہی تھی۔ مجھے کسی بھی مرحلے پر نیند کے بوجھ کا احساس نہیں ہوا۔ ہوا میں خنکی ضرور تھی لیکن کاٹ نہیں تھی۔ خزاں نے سبزے کے دروازوں پر دستک دینا شروع کر دیا تھا اِس لیے کسی جھونکے کے ساتھ بیل کے فالتو پتے گرنے کی خاموش سی سرگوشی بھی سنائی دے جاتی۔ خاموش سی سرگوشیوں کے اِسی شور میں مجھے سیٹی سنائی دی۔ ہمیشہ کی طرح، سیٹی کو سنتے ہی میں خوف زدہ ہو گیا۔ ٹھنڈ کے بجائے میرے اوپر ڈر کی برف باری ہونے لگی اور خوف کی شناسا سی جھرجھری میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں اُس سیٹی کے دہرائے جانے کی اُمید میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ سوچتے ہوئے اپنے کھڑے ہونے کی جگہ کی طرف چل دیا۔ وہ مجھے نظر تو نہیں آ رہی تھی لیکن پھر بھی میں اُسے وہاں کھڑے دیکھ سکتا تھا؛ کچھ پُراعتماد اور کچھ خائف، کچھ گھبرائی ہوئی اور کچھ مطمئن سی۔ مجھے لگا کہ وہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے ہنس رہی ہے۔ میں وہاں خاموش کھڑا رہا، اُس بچے کی طرح جس کا نئے سکول میں پرانے ہم جماعت کے ساتھ سامنا ہو گیا ہو۔ میں ابھی تک اپنی پرانی ذہنی کیفیت سے نکل نہیں پایا تھا کہ نوید میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مجھے اُس کا آنا ایک طرح سے گرمیوں میں ٹھنڈے جھونکے کی طرح لگا۔ مجھے اُس کی ہنسی نے ریوری میں سے نکالا۔

''کچھ بولو گے بھی؟''

''کیا بولوں؟ کہاں تھیں اتنے دن؟'' میں نے سوچتے ہوئے بات شروع کی، ''کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی تمھیں بلا سکوں؟'' میں نے ہنستے ہوئے بات ختم کی۔

''واہ جی! تاکہ مجھے گھر سے نکال دیں۔'' اُس نے مصنوعی سی حیرت سے کہا۔

''کون سا فاصلہ ہے، گلی پار کر کے آجانا۔''

''وہاں آ کر کیا کروں گی؟'' اُس کی آواز میں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ میں نے کبھی بالغ سنجیدگی کو اُس کے مزاج کا حصہ نہیں جانا تھا؛ اُس وقت کی شرارت بھری آواز نے مجھے ایک حد تک مخمور کر دیا۔

''وہی جو اُن ناولوں میں ہے!'' میں نے بھی اپنی آواز میں شرارت لاتے ہوئے کہا۔ اگلے

چند لمحوں کی خاموشی نے مجھے ایک طویل سفر کروا دیا؛ میں اچانک خود کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ پھر میں ہنسی کے ایک فوارے میں نہا گیا۔

''سارا کچھ؟'' وہ ہنسے جا رہی تھی۔

''ہاں ! سب کچھ !'' میں بھی آہستہ آہستہ ہنس رہا تھا۔ مجھے اپنے بدن میں ایک طرح کی کپکپی سی محسوس ہوئی، لگا کہ میں کسی اندھیرے اور یخ کمرے سے دھوپ میں آ گیا ہوں۔

نوید ایک نا ختم ہونے والے قہقہے کی لپیٹ میں تھی جسے سنتے ہوئے میں اُس کا چہرہ بنانے میں مصروف رہا۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوا کہ ہمارے بالکنیوں میں پروان چڑھنے والے تعلق میں ہم ایسے دل چسپ موقعوں پر ایک دوسرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئی اور میں محتاط، اُس ہرن کی طرح جو گھاس چرتے ہوئے ہوا کے جھونکے سے خائف ہو کر بھاگنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ''دروازہ کھولو ! میں آ رہی ہوں ۔'' اُس کے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ میں کچھ پریشان سا اندھیرے میں اُس آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ اور پھر وہی قہقہہ ..... میں شرمندہ سا قہقہے میں شامل ہو گیا۔
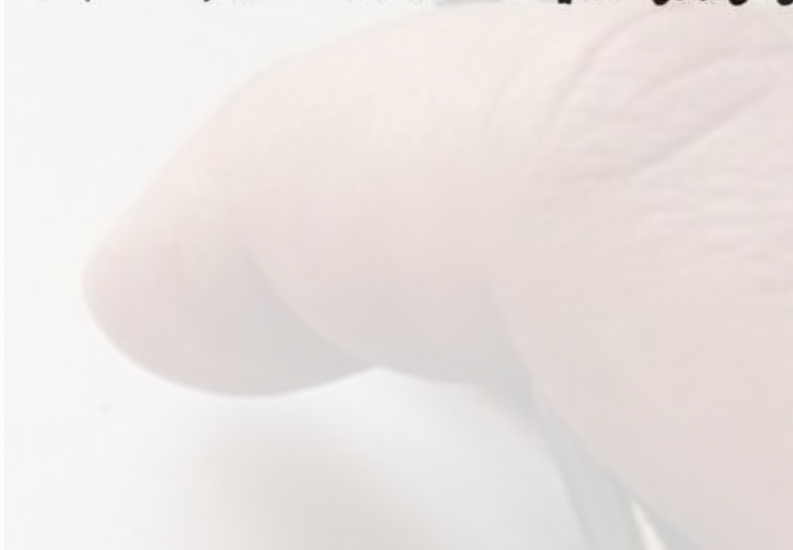
ایک دن ابا نے مجھے بلایا؛ بہت کم ہوتا تھا کہ ابا ہم میں سے کسی کو کسی کام کے سلسلے میں اکیلے میں بلائیں۔ میں کچھ کچھ پریشان سا اُن سے ملنے گیا۔ ایک دم کئی خوف اور خدشات نے مجھے اپنی زد پر رکھ لیا۔ کیا کالج میں میری حاضریاں کم ہونے کا مسئلہ تھا یا نوید کے ساتھ میرے بالکونی عشق کی خبر اُن تک پہنچ گئی تھی یا اُن کے کسی دوست نے چارخانوں والی دھوتی میں مجھے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا جس کی رپٹ ابا کو کر دی گئی تھی؟

میں جب کمرے میں پہنچا تو وہاں اندھیرا تھا۔ ابا اپنے پلنگ کے پاس پریشان سے کھڑے تھے اور لگا کہ مجھے دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئے ہیں۔ مجھے اُن کو ایسے دیکھ کر کچھ پریشانی سی ہوئی؛ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ ابا اِس طرح مجھے پریشان لگے ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اُن پر ترس آیا؛ وہ مجھے غیر محفوظ لگے اور میں اُن کے کسی کام آنا چاہتا تھا! میں اُن کے کس کام آ سکتا تھا؟ مجھے یہ تو نہیں معلوم تھا اور کچھ خائف بھی تھا کہ خدا جانے وہ کیا کہہ دیں یا پوچھ لیں!

''تم نے ہاشم علی خان صاحب کا گھر دیکھا ہوا ہے؟'' اُن میں معمول کی خود اعتمادی نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر عموماً وہ ہمیں کم تر سمجھا کرتے تھے۔ میں اُن کے رویے میں تبدیلی سے بھی کچھ خائف ہو گیا۔

''جی ہاں! سول لائنز میں نیشنل بنک کے پچھواڑے۔'' مجھے اپنی آواز میں کم اعتمادی محسوس ہوئی۔

''ہاں وہی!'' اُنھوں نے اپنی قمیص کی جیب کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں وہاں جانا

ہوگا۔'' وہ رکے، اُنھوں نے اپنی جیب کو پھر ٹٹولا، جیسے وہاں کسی شے کو ٹٹو رہے ہوں یا وہاں رکھی کسی چیز کو محسوس کر کے طاقت حاصل کر رہے ہوں۔ ''اور اُن کی بہن......کیا نام ہے اُن کا.....'' اُنھوں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے بات جاری رکھی اور میرا ماتھا بھی ٹھنکا ''ہاں یاد آیا، عنبر! اُن کو یہ رقعہ دینا ہے، کسی کی موجودگی میں نہیں۔'' وہ ایک دم فقرہ مکمل کر گئے اور جو اُنھوں نے کہنا تھا کہہ چکے۔ مجھے لگا کہ وہ ایک دم پر اعتماد ہو گئے ہیں جو مجھے اچھا بھی لگا۔ میں اُنھیں کسی اور روپ میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ''رقعہ دے کر جواب کا انتظار نا کرنا اور کل اِسی وقت جا کے جواب لے آنا۔ مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔'' اُن کی آواز میں چھپی ہوئی دھمکی کو میں سمجھ گیا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اماں جان کو بتانے سے متنبہ کیا تھا۔

میں وہ خط لیے باہر جانے کے بجائے اوپر کی طرف چل پڑا۔

''باہر کا راستہ اُس طرف ہے۔'' ابا کی آواز میں طنز تھا۔

''جی ہاں!'' میں نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا۔ ''راستہ اُسی طرف ہے۔ میں اوپر کنگھا وغیرہ کرنے جا رہا ہوں۔'' اور میں جواب سنے بغیر اوپر چلا گیا۔ میں نے لفافے کا غور سے جائزہ لیا۔ یہ سفید رنگ کا عام سا لفافہ تھا جو کسی بھی سٹیشنری کی دکان سے مل سکتا تھا۔ لفافے پر کوئی نام یا پتا درج نہیں تھا۔ میں اِسی طرح کا لفافہ خرید کے اِسے کھولنے کا فیصلہ کر کے اُردو بازار کی طرف چل پڑا اور مدینہ کتاب گھر سے اِسی طرح کا لفافہ خرید کے وہیں بنچ پر بیٹھ کر خط کھول لیا۔

''عنبر!

وصی کے ہاتھ آپ کو یہ چند سطور بھیج رہا ہوں۔ کل اِسی وقت آپ سے جواب لے لیں گے۔

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔

خیر اندیش''

ابا نے نیچے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ مجھے خط کے مندرجات کا علم نہیں اور خط دے کر چند سیکنڈ عنبر کی طرف دیکھتا رہا جیسے جواب کا منتظر ہوں۔ اُس کی حیرت زدہ آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں، پھر وہ ایک مخموری سی مسکراہٹ مسکرائی اور خط پڑھ کے میری طرف دیکھے بغیر بولی: ''کل اِسی وقت

جواب لے لیتا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ فلمی ہیروئین کی طرح اُچھل کود کر اپنی خوشی کا اظہار کرے گی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور اُس نے ایک کھوئی ہوئی سی نظر سے مجھے دیکھا۔ اُس نظر میں اُداسی اور حسرت تھے جس سے میں کسی حد تک خوف زدہ بھی ہو گیا۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ میں ابا کو پیشگی اطلاع کرنا چاہتا تھا لیکن پھر خوف زدہ بھی ہو گیا کہ ابا کے ساتھ کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا۔ پھر خیال آیا کہ اُن کے ساتھ دھوکہ کیا ہو گا؟

میں مزید کچھ سنے وہاں سے چلا آیا۔

گھر جاتے ہوئے میں پریشان سا رہا۔ عموماً میں جب کبھی سول لائن کی طرف آتا تو عنبر کے گھر ضرور چکر لگاتا، چاہے اُس سے ملاقات ہو یا نا ہو۔ میں جب عنبر والی گلی میں داخل ہوا تو میں نے اچانک اُس سے نا ملنے کا فیصلہ کر لیا، اس نے اگر پوچھ لیا کہ کدھر آیا تھا تو کیا جواب دوں گا! میں اُس کے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر آ گیا۔ مجھے خط پہنچا کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا، ایسے لگا کہ عنبر کے گھر جانے والا میرے بجائے کوئی اور تھا۔ کیا ہر پیغام رساں یہی سوچتا ہے؟ میں کافی دیر اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور شاید سو بھی گیا تھا کہ نیچے سے چائے کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ چائے پر ابا نے بھی ہونا تھا؛ کیا وہ میرا سامنا کر سکیں گے یا میں اُن کے چہرے کی طرف دیکھ پاؤں گا؟ میں جب نیچے گیا تو ابا ابھی کمرے سے نہیں آئے تھے ویسے وہ گھر میں موجود تھے کیوں کہ اُن کا بائیسکل ڈیوڑھی میں کھڑا تھا۔ ہم تینوں بھائی خاموش بیٹھے رہے جیسے وہ دونوں بھی میرے راز سے شناسائی رکھتے ہوں! اماں جان کی باورچی خانے میں برتن اُٹھانے اور رکھنے کی آواز نے گھر میں ایک حرکت رکھی ہوئی تھی اور میں اُنہیں آوازوں میں گم تھا۔

اماں جان ٹرے میں چار پیالے لیے مسکراتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئیں۔

''ابا گھر پر نہیں؟'' میں نے اپنی آواز میں آئے اطمینان کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''اُن کی طبعیت ٹھیک نہیں۔'' اماں جان نے لاتعلقی سے جواب دیا۔ میں نے اُن کے چہرے کی کسی گہرائی میں چھپے جذبات پڑھنے کی کوشش کی، وہ معمول کی طرح غیر اہم سی باتوں میں مشغول تھیں۔ اُنھیں برتن صاف کرنے والی خادمہ سے بے انت شکائتیں تھیں جو وہ اُس کے سامنے کبھی نہیں کرتی تھیں۔

ابا کی طبیعت ٹھیک ہوگی اُنھیں شاید اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ مجھے پیغام رساں بنانا مناسب نہیں تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ گھر میں سب سے مناسب پیغام رساں میں ہی تھا کیوں کہ میرے چھوٹے بھائیوں میں سے اگر کسی کو چنا جاتا تو ابھی تک اماں جان اور ابا ایک دوسرے کے گریبانوں سے لٹکے ہوتے۔ غالباً ابا بھی یہ بات جانتے تھے۔ مجھے اچانک اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ کیا میں اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ابا نے مجھے اپنا رازدار بنانے کا سوچا؟ میں کبھی خوشی، کبھی پریشانی اور کبھی ندامت سے چائے پیتا رہا اور جب چائے پی چکا تو اماں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا، ''طبیعت تو ٹھیک ہے تمھاری؟ تم تھکے تھکے سے لگ رہے ہو؟'' مجھے اماں جان کے سوال سے حیرت ہوئی۔ شاید ابا کو بھی میرے والی ہی بیماری تھی۔ میں چائے پینے کے لیے آتے ہوئے ابا کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا اور شاید اُن کی بھی یہی کیفیت ہو۔ میں نے چائے ختم کرتے ہی اُٹھ جانے کا فیصلہ کیا، شاید میں ابا کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میرے چلے جانے کے انتظار میں ہوں۔

''اماں جان! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ مجھے کچھ دیر ہو سکتی ہے۔'' میں نے چوری سے کھسکنے کے بجائے اعلانیہ جانے کا فیصلہ کیا۔

''اب رات کو وقت پر آجانا۔ جلی ہوئی باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔'' اماں جان کو میرا باہر جانا کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ اُن کے خیال میں گھر کے باہر بدمعاش، چور، جیب کترے، گماشتے اور ٹھگ وغیرہ بستے ہیں جنھوں نے مجھے اپنے ساتھ شامل کر لینا ہے۔ وہ ہم تینوں کی محافظ تھیں۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا!

اگلے دن مقررہ وقت پر میں ہاشم علی خان صاحب کے پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے راستے میں سوچا ہی نہیں تھا کہ مجھے عنبر سے جا کر جواب وصول کرنا چاہیے یا نہیں۔ میں بس ایسے ہی اپنے خیالوں میں گم پیڈل مارتے ہوئے، سرکلر روڈ سے ہو کر سول لائن پہنچ گیا۔ میں جب ہاشم صاحب کے گھر کے باہر کھڑا تھا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ کیا میں عنبر کا جواب وصول کرنے آیا تھا؟ بظاہر تو ایسے ہی تھا جب کہ میں پچھلے دِن غیر شعوری طور پر یہاں نا آنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے کچھ وقت گزر گیا تو احساس ہوا کہ یہاں طویل عرصے تک کھڑے رہنا مناسب نہیں ؛ مجھے یا تو ہٹ جانا چاہیے اور یا پھاٹک کھول کے عنبر سے ملنا! میں نے سامنے خالی سڑک کی طرف دیکھا، میرے پیچھے کچہری تھی۔ میں پھاٹک کے پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا؛ مجھے کسی طرف تو جانا تھا اور میں نے ایک لمبی سانس لی اور پھاٹک کھول کے اندر جھانکا۔ سامنے چھوٹا سا برآمدہ تھا جہاں ایک آرام کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر عنبر نیم دراز تھی۔ وہ شاید میرے انتظار میں تھی، مجھے شاید دیر ہو گئی تھی یا اُسے میرا انتظار تھا ہی نہیں اور وہ وہاں ویسے ہی نیم دراز تھی کہ میں شاید آ جاؤں !اگر اُسے میرا انتظار تھا تو اُس کے پاس ابا کے خط کا جواب بھی ہوگا۔ مجھے وہ جواب چاہیے جو میں لینے نہیں آیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اُٹھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک اپنائیت تھی جو میں اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ میں جواب میں مسکرایا نہیں، میں مسکرانے سے خائف تھا۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے ایک طرح سے اُلجھن کا شکار کھڑے تھے۔ میں وہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاؤں میرے وزن سے بھاری تھے، وہ بھی شاید کسی تنہائی میں پناہ لینا چاہتی تھی لیکن ایسی تنہائی شاید کہیں تھی ہی نہیں۔

''میں ابھی آئی!'' بہار میں نہائی ہوئی فضا میں اُس کی آواز سرگوشی ہوتے ہوئے بھی سرگوشی سے بلند تھی۔ کیا میں سمجھ پایا تھا؟ نہیں۔ میں اُس نے دوبارہ بولنے کو کہوں؟ میں جانتا تھا کہ اُس نے کیا کہا ہے! اگلے لمحے وہ وہاں نہیں تھی اور میں وہاں اکیلا کھڑا تھا۔ میں ابھی پلٹ جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ واپس آ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی اور نا ہی آنکھیں حیرت میں گم تھیں۔ اُس نے بند مٹھی کھول کر میری طرف بڑھا دی، ہتھیلی پر نفاست سے تہہ کیا ہوا ایک رقعہ رکھا ہوا تھا جسے میں نے اُٹھا لیا۔

برآمدے کے سامنے گولائی میں ایک چھوٹا سا لان تھا جس کے تین اطراف میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور سڑک کی طرف دیوار کے ساتھ سنتھے کی باڑ تھی۔ کیاریوں میں پینزی، اینٹرینیم، ایسٹر، پیٹونیا اور باڑ کے ساتھ سویٹ پیز کے پھول کھلے ہوئے تھے اور برآمدے میں بھینی بھینی سی خوشبو کا مجھے اُس وقت احساس ہوا جب عنبر نے رقعہ تھمایا۔ کیا عنبر نے رقعہ معطر کر کے دیا تھا؟ میں نے ایک لمبی سانس لے کر خوشبو سے بھری ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر کر رقعے اور باغیچے کی خوشبو کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی اور میرا جی خط سونگھنے کو چاہا؛ عنبر نے شاید میری سہولت کے لیے ہی اُسے لفافے میں بند نہیں کیا تھا۔ مجھے اُس معطر اور ہلکی پھلکی سی فضا میں عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے میں سانس تو لے رہا تھا لیکن ہوا پھیپھڑوں میں نہیں جا رہی تھی۔ مجھے عنبر کا جواب پڑھنے کی بھی جلدی تھی۔ یہ سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ ایک بے اختیار قسم کی مسکراہٹ تھی اور یقیناً اُس میں سے شرارت ٹپک رہی ہوگی کہ عنبر ایک دم میری طرف مڑی۔ میں نے سٹینڈ پر سے بائیسکل کو ہٹایا اور کسی قسم کے الوداعی کلمات کے بغیر گیٹ کی طرف چل پڑا۔

''رکو گے نہیں؟'' اُس کی آواز میں شوخی رقص کر رہی تھی۔ پھر اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''زبانی پیغام نہیں کوئی؟''

میں نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ برآمدے کے باہر آ گئی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہماری نظریں ملیں تو اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے، گردن کو ایک طرف جھکا کر، سلام کیا۔ وہ مجھ سے تقریباً پندرہ سال بڑی ہوگی لیکن اس وقت مجھے نوید کی ہم عمر لگی اور اُس کا وہ انداز دلبرانہ لگا۔ میرا جی رکنے کو کر آیا لیکن میں چلتا ہی رہا۔ مجھے جواب پڑھنے کی جلدی تھی۔

باہر نکل کر میں کچہری کی طرف چل پڑا اور کونے میں واپڈا کے دفتر کے سامنے جہاں آثم مرزا

کام کرتے تھے، رک کر جیب سے خط نکالا جسے پڑھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہاں صرف ایک شعر لکھا تھا:

دے کے خط، مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

میں کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ میں جوانی کے جھجکتے ہوئے تجسس کے ساتھ عنبر کے گھر اباکے لیے لکھا جواب لینے گیا تھا کہ اُسے پڑھ کر اُن کے تعلق کی نوعیت کا پتا چلے گا۔ میں شاید اُن کے تعلق کا نوید کے ساتھ اپنے رشتے سے موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یک دم نوید کی معصومیت پر ترس آنے لگا اور اپنے حلق میں کچھ اٹکتے ہوئے محسوس ہوا۔ عنبر مجھے ایک جہاں دیدہ اور چالاک عورت لگی؛ اُس کے الوداعی سلام میں ایسی بے ساختہ دلبری تھی جو کسی حد تک مجھے مصنوعی لگی۔ نوید کی ہر ادا میں معصومیت سے بھرپور شرارت تھی جس کا مقصد کسی کو رجھانا نہیں تھا اور نا ہی اُس میں کوئی نسوانی چلتر تھا۔ وہ ایک سادہ دل لڑکی تھی جو مجھے پسند تھی اور میں نہیں جانتا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی؟ اُس کے تعلق نے میری سوچ اور حواس کا پورا بوجھ میرے سینے پر ڈالا ہوا تھا اور میں اِس وزن کو کم کرنے کے لیے کسی کے ساتھ ساجھے داری کرنا چاہتا تھا۔ شبّر، نوید کو ناپسند کرتا تھا اِس لیے میں اپنی ذہنی اور نفسیاتی صورتِ حال کی اُس کے ساتھ ساجھے داری نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے نوید کو ناپسند کرنے کی جو وجوہات بتائیں، مجھے وہ نوید میں نظر نہیں آئیں لیکن عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس کے بارے میں ہر رائے غلط ہوتی ہے۔

میں وہیں کھڑا سوچتا تھا کہ مجھے شبّر نظر آیا۔ وہ میری طرح اپنے بائیسکل پر سے ایک پاؤں سڑک پر رکھے کھڑا تھا اور میری طرف دیکھتا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر جھینپ سا گیا۔ مجھے اپنے جھینپنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی؛ کیا مجھے کوئی شرمندگی تھی؟ وہ میرے پاس آ گیا۔ ''میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں، آپ چوتیوں کی طرح یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں۔ کوئی بہتر جگہ نہیں ملی آپ کو؟'' ہمیشہ کی طرح مجھے اُس کے مذاق میں طنز کا نشتر محسوس ہوا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ بھی تو کھڑا چوتیوں کی طرح مجھے دیکھے جا رہا تھا لیکن یہ قضیہ کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔ ''چائے پلا سکتے ہیں؟''

''یہاں!'' میں نے واپڈا کے دفتر کے ساتھ چائے کے کھوکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شبّر عموماً ایسے کھوکھوں میں چائے پینے سے کتراتا تھا، اُس کے اندر ایک بورژوا آباد تھا۔ اندر کرسیوں اور بینچوں پر وکیل اور واپڈا کے ملازم بیٹھے ہوئے تھے۔ شبّر ایک لمحے کو جھجکا۔ ''یہاں سگریٹ نہیں پی

سکتے۔ابا کا دفتر پاس ہی ہے اور اُن کا کوئی جونیئر یہاں سگریٹ پیتے دیکھ کر اپنے نمبر بنا سکتا ہے۔'' پھر وہ ایک دم ہنسنے لگ پڑا۔'' ہم بھی عجیب چوتیے ہیں۔کالج جا سکتے ہیں۔ میں تو ابا کے کسی کام کی وجہ سے نہیں گیا۔چلیں وہاں کینٹین میں چائے اور سگریٹ پیتے ہیں۔میرے پاس پیسے ہیں۔'' اُس نے قمیص کی جیب کو سہلایا۔'' آپ کالج کیوں نہیں گئے؟'' اُسے ایک دم خیال آیا۔

'' مجھے بھی ابا کا ایک کام کرنا تھا۔'' پھر مجھے خیال آیا کہ اُس کے ابا کا کام بھی میرے ابا کی طرح کا نا ہو! مجھے محسوس ہوا کہ میری مسکراہٹ میں شرارت سے بھرا اسرار تھا۔

کینٹین میں معمول کا مجمع تھا اور ہم سب کی نظریں بچاتے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ذکر تو نہیں کیا تھا لیکن کینٹین میں لوگوں سے نظر بچانے کی وجہ ہماری خالی جیبیں تھیں۔دوسرے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ چائے، شامی کباب اور سگریٹوں کا تبادلہ کرتے تھے جب کہ ہم چائے الگ الگ اور سگریٹ سانجھا پیتے تھے اور شاید وہ لوگ بھی ہماری اِس خستگی سے آشنائی رکھتے تھے کہ اُنھوں نے کبھی ہمیں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شبّر نے چائے کا اشارہ کیا اور ہم کینٹین کے اندر جاری فقرے بازی کو سننے لگے۔

'' غالب کا ایک شعر ہے!'' میں نے بات شروع کی۔

'' ارے چوتیا! اُس کا پورا دیوان ہے۔'' شبّر نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں پھر جھینپ سا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کبھی اُس کے ایسے تیز اور چبھتے ہوئے مذاق کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ پھر وہ سنجیدہ ہو گیا،'' کون سا شعر ہے؟''

'' دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے ''

چائے آ گئی تھی اور ہم نے مزہ لیتے ہوئے چند گھونٹ خاموشی سے پیے۔اُس وقت کینٹین میں بھی خاموشی تھی۔شبّر نے سگریٹ سلگا کے مکمل ارتکاز کے ساتھ ایک لمبا کش لے کے نیم وا آنکھوں کے ساتھ سگریٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی ایک لمبا کش لے کے آہستہ آہستہ دھوئیں کو پھیپھڑوں میں سے نکالتے ہوئے سگریٹ شبّر کی طرف واپس کیا تو کینٹین قہقہوں سے گونج اُٹھی۔صادق خان جو سول لائن میں رہتا تھا اور شبّر کے ساتھ بے تکلف بھی تھا، بولا،'' شاہ جی! سگریٹ پی رئے او یا سلفہ؟

''شبّر قہقہ لگا کر ہنسنے لگا اور میں بھی اپنی کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ اُس شور میں شامل ہو گیا۔

''خان جی! ہم آپ کی طرح فضول خرچ نہیں ہیں۔'' شبّر نے جواب دیا۔

''شاہ جی! جاناں بناؤ۔'' صادق خان نے ہنستے ہوئے کہا اور سب اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

''اُس شعر کا کیا ہوا؟'' شبّر نے پوچھا۔

''دیوان سے نکل گیا ہے۔'' شبّر نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کے ہنسنے لگا۔

''اِس شعر کا کب حوالہ دیا جاتا ہے؟''

وہ پھر ہنسنے لگا۔ ''اسلم صاحب سے تو نہیں ملے اِن دنوں میں؟'' وہ رکا اور پھر ہنسنے لگا، ''ایسا ہی کوئی شعر لا کے اُس پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ دستوفسکی کی ابھی تک جان نہیں چھوٹی۔'' اِس دفعہ میں بھی ہنسنے لگا۔ ''میرے خیال میں نامہ بر بھی مبتلا ہو گیا ہے۔'' اُس نے سوچتے ہوئے کہا اور شرمندگی سے میری بغلوں میں پسینہ آ گیا۔ میں نامہ بر تھا اور کیا میری نظر یا انداز میں کچھ ایسا تھا کہ عنبر کو میری شکایت لگانا پڑی؟ ہم سگریٹ ختم کر چکے تھے اور مجھے ایک اور کی ضرورت تھی۔ مجھے اپنی تنگ دستی پر غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔ کیا ہمارے ہاں یہ دستور تھا کہ نوجوان بیٹوں کو معاشی طور پر محروم رکھ کر زندگی کی شاہراہ پر دھکیلا جائے؟ میرے گھر کے معاشی حالات اگر اتنے برے نہیں تھے تو اُنھیں اچھے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شبّر کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اُس کے ابا گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ کورٹ بار کے ایک اہم رکن تھے اور فوجداری مقدموں میں اُن کا نام تھا۔ اُنھیں منہ مانگی فیس ملتی تھی لیکن شبّر کو بھی میری طرح جیب خرچ نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر میں ابا سے کہوں کہ میں اب بی اے میں تھا اور مجھے کینٹین میں کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ چائے پینے کے لیے جانا ہوتا ہے جس کے لیے میرے پاس کچھ پیسے ہونے چاہئیں۔ مجھے ابا کے مختصر سے جواب کا علم تھا۔ ''میاں! کینٹین میں مت جایا کرو۔''

میں ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا جو میری حیثیت سے بھاری تھی۔ میں اپنے باپ کا نامہ بر تھا اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اُن کی محبوبہ میرے ساتھ بھی کسی قسم کا تعلق رکھنا چاہتی تھی۔ مجھے اُس تعلق کی نوعیت کے بارے میں علم تو نہیں تھا لیکن میں ایک اخلاقی بے قاعدگی میں ملوث ہوتا جا رہا تھا۔ میں عنبر سے صرف نامہ بری کا تعلق رکھنا چاہتا تھا اور اُسے اپنے زبانی پیغام سنانا میرے لیے ایک غیر ذمے دارانہ حرکت تھی جس کا میں ارتکاب کیے جا رہا تھا۔ وہ بعض اوقات دِن میں ابا کو تین فضول قسم کی تحریریں بھیجتی اور میرے خیال میں جن کا مقصد صرف مجھے بلانا تھا۔ گرمیاں آ گئی تھیں اور کیاریوں میں پھولوں کی خوشبو نہیں تھی، زینیا کے رنگ تھے؛ بڑے بڑے پھول جو اصلی نہیں لگتے تھے تاوقتیکہ اُنھیں چھوا جائے۔ مجھے دوپہر کو، کالج سے واپسی پر، خط ضرور لینا ہوتا تھا۔ اُس وقت گرمی زوروں پر ہوتی تھی اور پیاس بھی۔ برآمدے میں دو فرنچ دروازے کھلتے تھے؛ ایک ڈرائنگ اور دوسرا ڈائننگ روم کا۔ اُن کے پیچھے دو سونے کے کمرے تھے اور ڈائننگ روم کے پیچھے والے کمرے کے ساتھ ایک سٹڈی روم تھا جسے عنبر کی طلاق کے بعد اُس کی خواب گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اُس کمرے میں جانے کے لیے ایک دروازہ ڈائننگ روم سے جاتا تھا اور ایک بیڈ روم سے۔ باورچی خانہ ذرا ہٹ کے تعمیر کیا گیا تھا اور وہاں سے ڈائننگ روم تک آنے کے لیے چھتا ہوا راستہ تھا جس پر بارش میں بھی کھانے کے پہنچانے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ میں جب خط لینے جاتا تو وہ برآمدے میں میرے انتظار میں ہوتی۔ آرام کرسی کے اوپر چھوٹے بلیڈوں والا پنکھا چل رہا ہوتا اور وہ پنکھے کے نیچے کھڑی مجھے قریب آنے کا اشارہ کرتی۔ میں یہاں پہلے دِن کے اپنے چکر کے بعد اب تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا اور مجھے اُس کے قریب کھڑے ہونے میں کوئی

اُلجھن یا جھجک نہیں تھی۔ اب میں دعوتوں اور پھیکے سے مشاعروں میں اُس کے پاس بھی بیٹھ جاتا اور کبھی کبھار اُس کے کسی مذاق کے جواب میں ہنس بھی دیتا۔

میں اپنے بائیسکل کو سٹینڈ پر کھڑا کر کے پنکھے کی گرم ہوا کی حفاظت میں چلا جاتا۔ وہ پسینے میں تر میرے چہرے کو دیکھتی اور میں محسوس کرتا کہ وہ ایک نظر بغلوں کے نیچے گیلی اور چھاتی کے ساتھ چپکی ہوئی قمیص پر ڈالتی۔ مجھے لگتا کہ وہاں دیکھنا اُس کی کسی نفسیاتی خواہش کی تسکین کا باعث تھا۔

''اندر آؤ اور کچھ ٹھنڈا لے لو۔'' یہ روزانہ کا فقرہ تھا اور مجھے اِس دعوت کا انتظار ہوتا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملتی ہے؟ سوائے آنکھوں میں مختلف قسم کے تاثرات سے دیکھنے کے اُس نے مجھے کبھی کوئی پیغام یا اشارہ نہیں دیا تھا؛ میں اُس کے دیکھنے سے خائف سا تھا۔ ہم کھانے کے کمرے میں سے گزر کے اُس کی خواب گاہ میں چلے جاتے۔ برآمدے کی نسبت وہ کمرہ کافی ٹھنڈا تھا اور بھاری پردے باہر کی روشنی کو یہاں شکست دے کر خنکی کے احساس کو اُجاگر کرتے تھے۔ وہ مجھے وکٹورین طرز کی ایک کرسی پر بٹھاتی، میری طرف ایک ناشناسا سی نظر سے دیکھتی، دھیمے سے مسکراتی، باورچی خانے کو جانے والے دروازے کے پاس رُک کر مجھے دیکھتی، اب اُس کی نظر اور مسکراہٹ میں اپنائیت ہوتی اور باورچی خانے کی طرف نکل جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد ٹرے میں کانچ کا جگ اور دو گلاس رکھے داخل ہوتی۔ مجھے گلاس تھما کر وہ الماری میں سے نائس بسکٹوں کے ڈبے میں سے چار بسکٹ طشتری میں رکھنے کے بعد ایک خود اُٹھا لیتی اور میں شربت کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ بسکٹ کھاتا جاتا۔ اِس تمام عرصے میں وہ مجھے مختلف تاثرات کے ساتھ دیکھتی جاتی اور میں ہر بار نظر بچاتا جاتا۔ میں اِس مختصر سے عرصے میں جان گیا تھا کہ انسان کی شخصیت کے کئی رُخ ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت کئی کردار نبھا رہا ہوتا ہے۔ اُسے نا تو کسی منظر نامہ نگار کی ضرورت ہوتی ہے اور نا ہی کسی ہدایت کار کی۔ اُس کے اپنے اندر ہی منظر نامہ نگار، ہدیت کار اور اداکار موجود ہوتا ہے۔ عنبر اور میں اپنے اپنے مختلف نوعیت کے کرداروں کی ادائی میں گم تھے۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ صرف وہ ہی جانتی تھی۔ میں کیا چاہتا تھا مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ جاننا شاید میرے کردار کی کہانی کا حصہ نہیں تھا؛ ممکن ہے کہ عنبر اپنے کردار کے متعلق جانتی ہو۔ اُس کے کردار میں ابا کو دھوکہ دینا تھا۔ ابا ہر خط میں اُسے ملنے کی درخواست، استدعا، منت یا مانگ کرتے اور عنبر ہر بار کمال ہنرمندی کے ساتھ اُنھیں پھسلا دیتی۔ ابا گھر میں چڑچڑے اور کھوئے کھوئے سے رہتے۔ وہ شاید اماں جان کی سخت مزاجی سے گھبرا

گئے تھے یا ممکن ہے کہ اُنھیں عنبر صحیح معنوں پسند ہو اور اُنھوں نے اماں جان کے ساتھ زندگی گزار کر اپنی زندگی کو ضائع کر دیا ہو۔ مجھے ایک تجسس عنبر کے پاس کیے جا رہا تھا اور مجھے کبھی وہ اچھی بھی لگتی۔ ہم دونوں اُس کی خواب گاہ میں بیٹھ کے اجنبیوں کی طرح وقت گزار دیتے۔ ہم شاید اجنبی ہی تھے۔ انسان وہی کرتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔ جیب کترا جیب اِس لیے کاٹتا ہے کہ وہ جیب کترا ہوتا ہے؛ ایک درزی کو جیب کاٹنا نہیں آتی کیوں کہ یہ اُس کا کام نہیں۔ اگر ہم اجنبی نا ہوتے تو آپس میں گھل مل جاتے۔

میں عنبر کے قریب نہیں تھا لیکن دور ہوتے ہوئے دور بھی نہیں تھا۔ اگر کسی طرح میں اُس سے دور ہوتا تو اُسے ملنے ہی نا جاتا۔ مجھے ملنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ میں غروبِ آفتاب کے بعد گھر سے نکل جاتا اور اپنے بزرگ دوستوں کو ڈھونڈ کر اُن کے اپنے دوستوں کے ساتھ مکالمے سنتا۔ اُن کی باتیں سنتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کی برتری کا بھی احساس ہوتا۔ اُن مباحث میں اکثر کتابوں کا ذکر آتا جنھیں میں ڈھونڈ کر پڑھتا۔ میں جان گیا تھا کہ اُسی انسان کی زندگی کارگر تھی جس کے پاس علم تھا۔ اُن میں اور کسی سرمایہ دار کے درمیان میں وہی فرق تھا جو فکشن اور کالم میں ہوتا ہے۔ شاید میں فکشن نگار تھا اور عنبر کالم نگار۔ یہ فرق جاننے کے لیے صاحبِ مطالعہ ہونا ضروری تھا اور عنبر یقیناً صاحبِ مطالعہ نہیں تھی۔ میں سوچتا: کیا انسان اُسی کے پاس جاتا ہے جو اُسے پسند ہو! کیا عنبر مجھے پسند تھی؟ اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔ میرا مشاہدہ تھا کہ بڑے اُسی بچے کو پسند کرتے ہیں جو ہوشیار اور شیطان ہو۔ عنبر ویسے بچوں کی طرح تھی جسے بڑوں کو متوجہ کرنا آتا ہے۔ نوید ایک خوش شکل بچے کی طرح تھی جو ہوشیار اور شریر نہیں تھا اور اُسے بڑوں کو متوجہ کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا اور ایک ہی جگہ پر بیٹھے قہقہے لگاتا رہتا ہے۔ کسی نے پاس سے گزرتے ہوئے چٹکی کاٹ لی تو کھلکھلا کر ہنس دیا۔ نوید سے ملے ہوئے مجھے کئی دن ہو گئے تھے جب کہ عنبر مجھے روزانہ بلا لیتی۔ وہ مجھے کیوں بلاتی تھی؟ میں اپنی اِس اُلجھن کا حل نا ڈھونڈ سکا۔ میں زہرخند سے سوچتا: کیا میں ابا سے پوچھوں؟ میں تو تصویر کے دونوں رخ دیکھ سکتا تھا جب کہ عنبر اُن کے لیے شاید ایک اسرار تھی۔ کیا ہم کسی دن اپنے اپنے رازوں کی ساجھے داری کر پائیں گے؟ شاید اِس دنیا میں نہیں۔

میں شربت ختم کر کے اُس کی طرف دیکھتا، وہ مجھے دیکھ رہی ہوتی۔ یہ سب کچھ اپنے آپ ہی، کسی نظام کے تحت ہو رہا ہوتا جیسے بار بار ریہرسل کی گئی ہو۔ اُس کی نظر خالی ہوتی تھی جیسے میرے گلاس ختم

کرنے کے انتظار میں ہو۔ میں اُٹھ کھڑا ہوتا اور وہ بھی۔ میرے ہاتھ سے گلاس لے کے وہ تپائی پر رکھتی اور میری طرف دیکھتی۔ اب اُس کی نظر میں ایک پکار ہوتی، جیسے مجھے جانے سے روک رہی ہو۔ مجھے بہت پرانی کہاوت یاد آ جاتی کہ جانے والے کو کون روک سکتا ہے؟ میں دروازے کی طرف جانے کے لیے ہلتا تو وہ بڑھ کے دروازہ کھول دیتی۔ میں پاس سے گزرتے ہوئے اُسے دیکھتا، اب اُس کی نظر کے ساتھ ہونٹ بھی شامل ہوتے؛ مجھے وہاں ایک پیاس نظر آتی۔ میں ڈائننگ روم میں سے ہوتے ہوئے برآمدے میں آ جاتا، وہ میرے پیچھے چل رہی ہوتی۔ میں بائیسکل کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ وہ اسرار بھری راز داری کے ساتھ میرے قریب آتی اور مجھے رقعہ تھما دیتی۔ میرے لیے اچانک وقت ایک اہم اکائی بن جاتی؛ مجھے وہاں ٹھہرنا وقت کا ضیاع لگتا، وہاں سے نکلنے کی جلدی ہوتی کیوں کہ خط کا متن آواز دے رہا ہوتا۔ ابا کو یقین تھا کہ میں اُن کے خط نہیں پڑھتا جب کہ عنبر کو شک تھا کہ میں پڑھنے کے بعد خط ابا تک پہنچاتا ہوں۔ ابا اپنے جذبات اور احساسات بغیر جھجک کے لکھتے کیوں کہ اُنھیں یقین تھا کہ اُن کا لکھا صرف عنبر ہی پڑھتی ہے۔ عنبر نے کبھی ایک دبی ہوئی سی چاہت کے علاوہ ابا کے ساتھ کسی اور جذبے کی ساجھے داری نہیں کی تھی۔

مجھے وہاں سے نکلنے کی جلدی ہوتی۔ میرا پسینہ خشک ہو چکا ہوتا تھا اور میں خط کو نوٹ بک کے بجائے جیب میں ڈالتا اور واپڈا کے دفتر کے ساتھ گھنے درخت کی چھاؤں میں پڑھنے کے بعد مایوس سا گھر کی طرف چل پڑتا، عنبر کے خط بے رس ہوتے تھے۔ ابا کے خط پڑھنے کے بعد مجھے احساسِ جرم گھیر لیتا جب کہ عنبر کے خط اُسی احساس کو زائل کر دیتے اور میں ابا کا جواب وصول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

ایک بار مجھے شام کو بلایا گیا، معمول کے مطابق میں کالج جاتے ہوئے خط دے جاتا تھا اور واپسی پر جواب لیتا۔ اُس شام کو جب میں پہنچا تو روز کی طرح وہ برآمدے میں نہیں تھی؛ میرے لیے یہ باعثِ حیرت تھا۔ میں اُسے کیسے بلاؤں؟ میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لان کے سڑک والے کونے میں ایک نل لگا ہوا تھا جس کی ٹونٹی کھلی ہوئی تھی اور حوضی میں سے پانی لان کو سیراب کر رہا تھا۔ میں کھڑا پانی کو زمین میں جذب ہونے کے بعد آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا اور کچھ دیر کے بعد اُکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ میں نے واپس جانے سے پہلے بائیسکل کی گھنٹی بجانے کا فیصلہ کیا اور گھنٹی کی آواز سے خود ہی لطف اندوز ہوتے کئی بار گھنٹی بجائی تو وہ کھانے والے کمرے کے فرنچ دروازے میں سے باہر نکلی۔ اُس

کے گیلے بال کندھوں پر لٹک رہے تھے جس کی وجہ سے وہ اِتنی پتلی نہیں لگی؛ کوئی کوئی بوند ابھی تک فرش پر گر رہی تھی۔ ڈوبتی روشنی شام کے سانولے پن میں تبدیل ہو رہی تھی اور وہ میرے سامنے اُسی منظر کی طرح کھڑی تھی۔ اُس کی نظر میں ایک سوال تھا۔

''تم رات کا کھانا یہاں کھاؤ گے!'' اُس نے مجھے حکم دیا تھا۔ میں احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''بھائی صاحب اور اُن کا خاندان کہیں گئے ہوئے ہیں، میں گھر میں اکیلی ہوں۔ بہت کم ہوتا ہے کہ میں کھانا بناؤں۔ ہمارے ہاں تم نے جتنے بھی کھانے کھائے ہیں وہ بھابھی بناتی تھیں۔ آج میں اپنے ہاتھ سے بناؤں گی۔''

''مجھے تو یہاں تمھارے علاوہ کبھی کوئی نظر نہیں آیا۔'' میں نے تقریباً الزام لگایا۔

''تم جب آتے ہو وہ اُن لوگوں کی ذاتی مصروفیت کا وقت ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت وہ لوگ کھانا کھا رہے ہوتے ہیں۔ بھیا کا نظریہ ہے کہ کھانا مکمل خاموشی میں کھایا جائے؛ صرف پلیٹ پکڑا دو یا چپاتی اِدھر کریں یا چاول کی طشتری وہاں کھ دیں کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوتی۔ اُن کا خیال ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ خاموشی سے کھاتے ہوئے کھانے کی اثر اندیزی زیادہ ہوتی ہے۔ اور صبح کے وقت وہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ بھابھی دیر سے اُٹھنے والوں میں سے ہیں۔'' اُس نے مجھے اطلاع دی۔

وہ کھانے والے کمرے میں سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ شام کے وقت اُس کا کمرہ ایک جادوئی تاثر لیے ہوئے تھا؛ بھاری پردے اور مدھم سی روشنی کمرے کو ایک خوب میں گم کیے لگ رہے تھے۔ میں سراسیمگی کے عالم میں کھڑا کبھی کمرے کے اسرار کو جاننے کی کوشش کرتا اور کبھی عنبر کے بالوں کے اُس کی حیران آنکھوں پر پڑتے سائے کی دل کشی سے لطف اُٹھاتا۔ ہم کمرے میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے؛ میں سراسیمہ اور وہ پُر اعتماد!

''چلو! باورچی خانے میں چلتے ہیں۔ میں نے تمھارے لیے وہاں کرسی رکھی ہوئی ہے، تم بیٹھنا اور میں کام کروں گی۔'' اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی نسوانی لمس کو محسوس کیا تھا، اماں جان کا مجھے چھونا کوئی نسوانی چھونا نہیں تھا؛ وہ تو ایک ماں اور بیٹے کے رشتے کی تصدیق تھی۔ عنبر نے مجھے ہاتھ سے پکڑا تو ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے مجھے اپنی ٹانگیں

بے جان سی محسوس ہوئیں اور جسم اتنا بھاری کہ اُن سے اُٹھایا ہی نا جا سکے۔ پھر بدن میں اتنا کھچاؤ آ گیا کہ میرے لیے قدم اُٹھانا مشکل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اُس کا ہاتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دبا دیا ہے۔ اُس نے ایک دم میری طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں تکلیف، پھر حیرت اور اگلے ہی لمحے ہر تاثر غائب ہو گیا اور وہ خالی چہرے اور مرطوب ہونٹوں کے ساتھ مجھے دیکھتی تھی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں شناسائی واپس آئی اور گلے میں سے ایک دبی ہوئی سی آواز، جیسے خالی برتن کو بھرا جا رہا ہو، مجھ تک پہنچی:

''چلو چلیں!''

میرے لیے چلنا مشکل تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے آگے کی طرف چلی۔ میرے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے، میں قدم نہیں اُٹھا سکا اور مجھے نہیں پتا کہ کیسے ہوا، میں نے اُسے اپنی طرف اس زور سے کھینچا کہ ہم گرتے گرتے بچے۔ اسی لڑکھڑاہٹ میں وہ میرے ساتھ لگ گئی اور میں نے اُسے اتنے زور سے بھینچا کہ اُس کے منہ سے گھٹی ہوئی سی چیخ نکل گئی۔ مجھے یک دم اپنے اندر ایک کمی، خلا یا مکمل نا ہونے کا احساس ہوا۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی، اُس کے بدن سے میرا خلا بھر رہا تھا، میں ہانپتے ہوئے تکمیل کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ میری ہر کمی کو پورا کر رہی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا؛ اُس کی آنکھوں میں تسکین تھی اور مجھے اپنی نظر میں شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں کس سے شرمندہ تھا؛ ابا سے، عنبر یا خود اپنے آپ سے اور ممکن ہے نوید سے!

میں ابا سے کترانے لگا اور کئی دن اُن کے سامنے نا آیا۔ میں بی اے کے اُن طالب علموں کی طرح تھا جو ابھی اتنے پختہ نہیں ہوئے ہوتے کہ زندگی کے اسرار جان جائیں۔ میں اپنے مخصوص حالات کی بدولت انسانی رشتوں کے متعدد پہلو سمجھ گیا تھا۔ ہر انسان خود غرض ہوتا ہے اور اُس کی خود غرضی کی گہرائی میں ایک بے غرضی چھپی ہوتی ہے جسے وہ خود بھی نہیں جانتا اور اِسی طرح بے غرضی کی گہرائی میں خود غرضی چھپی ہوتی ہے جسے وہ اچھی طرح پہچانتا ہے۔ عنبر نے ایک دن ابا کو لکھا: اُسے شک تھا کہ میں اُس کے بھیجے ہوئے خط پڑھتا ہوں اور یہ کہ وہ آئندہ پیغام رسانی کا بندوبست کر لے گی۔ میرے لیے جہاں یہ ایک نجات کا ذریعہ تھا وہاں میری انا کے کے لیے ایک نا قابلِ بیان شکست بھی۔ گو میں دونوں کے درمیان میں ہونے والی خط و کتابت کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھتا تھا لیکن میرا اخلاقی جرم اُن کی قانونی، مذہبی اور سماجی بے ضابطگی سے کم تھا۔ میں صرف خط پڑھتا تھا، اگر میں ان پڑھ ہوتا تو شاید نا پڑھتا اور میری حالت ٹیلی فون کے تار پر بیٹھے اُس کوے جیسی ہوتی جسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ پنجوں میں سے زندگی اور موت کے کتنے اہم حادثات گزر رہے ہوتے ہیں۔ میں پڑھا ہوا ہونے کے سبب متجس تھا اور اُن کے خطوط پڑھنا اُسی تجسس کی توسیع تھی۔

عنبر عورت کا حربہ آزما گئی۔ ہر عورت راز اور اسرار کا امتزاج ہوتی ہے۔ اُسے اپنے چہرے کے تاثر کو بدلے بغیر باپ، بھائی، خاوند یا عاشق سے اپنے جذبات کو چھپانے کا ہنر آتا ہے اور وہ سب کر گزرنے کو تیار ہوتی ہے جو ممکن نہیں ہوتا۔ ابا اور میں بھی اُس کی زد پر تھے۔ عورت اپنے آپ کو کویا کی طرح نرم دھاگوں میں لپیٹ کر چھپا لیتی ہے اور پھر ایک ایک دھاگہ ہٹا کر نظر آئے بغیر اپنے آپ کو

سامنے لاتی ہے۔ اُس نے مجھے اپنے کئی روپ دکھائے۔ وہ معصومیت میں ڈوبی ہوئی ایک طالب علم تھی جو بالکونی میں کھڑے ہو کے ایسے معاشقے میں ملوث تھی جس میں اُس کی کوئی مانگ نہیں تھی ؛ وہ تو بس وہاں کھڑے ہنستی تھی اور میں اُس ہنسی کے ترنم میں ڈوب کر اُس کے چہرے کے تاثر کو تعبیر کرتا تھا کیوں کہ وہ دن کے اُجالے میں بیل کی حفاظت میں نہیں آتی تھی۔ میں سول لائن کی ایک کوٹھی میں ابا کا رقعہ ایسی طلاق یافتہ عورت کو پہچانے جاتا تھا جو مجھے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اُسے مجھے رجھانے کا ہر طریقہ آتا تھا اور میں اُس کے سامنے بے بس تھا۔ کیا عورت کے طریقہ کار میں ایک بے رحمی تھی یا کسی طرح کی لاتعلقی جو مجھے اُس کے جال میں لے گئی؟ کیا اُس نے جال بچھایا تھا یا میں ہی اپنی سادگی سے اُس جال میں اُلجھ گیا؟ دونوں عورتیں سماجی اور معاشی حیثیت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ کیا وہ دونوں مجھے استعمال کرنا چاہتی تھیں یا مجھے استعمال کر کے اپنے لیے کوئی سہولت تلاش کرنا چاہتی تھیں۔ شاید اُنھیں سماجی ضمانت کی ضرورت تھی جس کے لیے انسان نے قانون بنائے اور وہ مجھے سامنے رکھ کر اپنے مفادات کو آگے بڑھانا چاہتی تھیں۔ یا پھر اُنھیں معاشی تحفظ کی ضرورت تھی جس کے لیے امیر آدمی دولت کے انبار لگا رہا تھا جب کہ ایک غریب اپنی غربت کے اندھیروں میں ڈوبا دولت کے انبار کو نفرت سے دیکھتے ہوئے اُسی دولت کو سمیٹنا چاہتا تھا اور جب یہ اُسے مل جائے تو اُس کا رویہ وہی ہو جاتا ہے جس رویے سے اُسے نفرت تھی۔ میں اُنھیں کس قسم کا معاشی تحفظ فراہم کر سکتا تھا؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا لیکن وہ مجھے برباد ضرور کرنا چاہتی تھیں تا کہ میں کسی دوسری عورت کو اپنا ہم سفر نا بنا سکوں۔ عنبر نے ایسے حالات پیدا کیے کہ میں اُس کے ساتھ ایسے تعلق کو تعمیر کروں جس کی بنیاد جنس پر ہو۔ انسان نے جنسی بے راہ روی کو نکیل ڈالنے کے لیے شادی کے ادارے کو پروان چڑھایا تا کہ انسان رشتوں کو پہچانتے ہوئے اُن کی قدر کر سکے۔ عنبر طلاق یافتہ تھی اور وہ ابا کو ایک ایسے رشتے میں اُلجھانا چاہتی تھی جو اُسے سماجی اور معاشی تحفظ فراہم کرے جب کہ میں اُس کی شہوت کی تسکین کا سبب بنا رہوں۔ نوید کی شہوت اُس کے قہقہوں میں چھپی تھی اور وہ اُنہیں قہقہوں کے زور پر مجھے اپنے بس میں رکھنا چاہتی تھی۔

شہر میں ایک جین مندر تھا جس کا شمار پنجاب کے اہم مندروں میں ہوتا تھا۔ اُس مندر کی دیکھ بھال سول ڈیفنس کے حوالے تھی اور سول ڈیفنس آفیسر کا سالا شمر کا اور میرا ہم جماعت تھا۔ ایک دن وہ مجھے مندر دکھانے لے گیا۔ مندر پہلی منزل پر تھا جب کہ زمینی منزل پر سبزیوں کی دکانیں تھیں۔ اوپر جانے

کے لیے تاریک سیڑھیوں پر سے جانا ہوتا تھا۔ سیڑھیاں ایک صحن تک جاتی تھیں جسے عبور کر کے مندر میں داخل ہوتے تھے۔ صحن کو عبور کر کے پوجا کا کمرہ تھا جس کا فرش سنگِ مرمر کا تھا اور چاروں دیواروں پر بنی تصویروں میں تناوری کو نروان کی تلاش میں مختلف شکلوں میں دکھایا گیا تھا۔ اس کے سر پر کوئلے رکھے جا رہے تھے، پاؤں تلے کانٹے تھے اور گلیوں میں بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ تصویریں کسی ناآموز مصور کی بنائی ہوئی تھیں لیکن متعدد فنی خامیوں کے باوجود اُن میں ایسی تاثیر تھی کہ اُن پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ پوجا والے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اندھیرا کمرہ تھا جس میں تین قدِ آدم بت رکھے ہوئے تھے۔ اِس کمرے سے اوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں جہاں غالباً پروہت کی رہائش رہی ہوگی، وہاں اب ایک کھری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ شہزاد مجھے ایک طویل خطبہ دیتا رہا جب کہ میرے ذہن میں مندر کو استعمال میں لانے کے کئی منصوبے بن رہے تھے۔ صرف اگر عنبر کسی طرح یہاں تک آسکے!

اُس شام کے بعد عنبر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہر اتوار کو میرا انتظار کرے گی اور میں موقع ملتے ہی اُسے ملنے جاتا۔ اُس کے بھائی کا خاندان ابھی سو رہا ہوتا اور ہم اُس کی خواب گاہ میں دیر تک ایک دوسرے کو تھامے ہوئے رہتے۔ مجھے وہاں ایک خوف گھیرے رکھتا۔ اُس کا بھائی بھی وہاں آسکتا تھا اور ممکن ہے کہ ابا بھی کسی وقت آجائیں۔ عنبر کے خط کے بعد ابا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کی نظر میں نا تو کوئی الزام تھا اور نا ہی شکایت، بس ایسی نظر جس میں بے بسی، شکست اور خالی پن تھا۔ مجھے اپنے رویے پر شرمندگی بھی ہوتی لیکن یہ احساسات اور جذبات عارضی ہوتے اور میں عنبر کے جسم کی لذت میں اتنا گم تھا کہ اخلاقیات اپنے معنی کھو بیٹھے تھے۔ میں ابا کی نظر میں مایوسی کی پروا کیے بغیر کسی اتوار کو عنبر کی خواب گاہ میں موجود ہوتا۔ وہاں کی ظاہری حفاظت کے باوجود مجھے ایک خوف نے گھیر لیا کہ یہاں کسی دن کوئی کمرے میں داخل ہو سکتا ہے۔ مجھے لگا کہ شہزاد نے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ کیا عنبر مندر میں آسکے گی؟

''ہم کہیں باہر مل سکتے ہیں؟'' ایک ملاقات میں میں نے پوچھا۔ مجھے اُس وقت کسی کمرے سے قدموں اور دبی دبی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے عنبر کے چہرے اور آنکھوں میں پریشانی نظر آئی لیکن اُس نے کسی قسم کے اضطراب یا خوف کا اظہار نہیں کیا۔ اُس نے میرے سوال کو بظاہر عدم دلچسپی سے سنا۔ عموماً وہ ہر بات تفصیل سے کیا کرتی تھی شاید وہ پریشان تھی، اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہاں ایک جین مندر ہے جس کی چابی میں حاصل کرلوں گا اور ہم وہاں جایا کریں گے۔''

اُس نے فوری طور پر جواب نہیں دیا اور وہ حیرت میں گم مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔

''ہوش میں ہو؟'' آخر وہ بولی۔ اُس کی آواز میں تجسس، خوشی یا اُمید نہیں تھے، وہ مجھے کسی حد تک خائف لگی۔ ''ہوش میں ہو'' اُس نے دہرایا۔

''ہوں تو ہوش میں۔'' میں نے شگفتگی کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ ہم اپنے معمول کے لہجوں کے بجائے سرگوشی میں بات کرر ہے تھے۔ ''وہ جگہ کم ازکم یہاں سے محفوظ ہوگی۔'' میں نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے اُس کی ہاں میں مجبوری محسوس ہوئی۔ ''وہاں روحیں تو نہیں ہوں گی؟''

اب وہ واقعی خوف زدہ تھی۔

''وہ ویران جگہ نہیں۔ نیچے بازار ہے اور مندر کے اوپر جانے والی سیڑھیوں کے ساتھ کنجڑوں کی دکانیں ہیں۔ اُس سے آباد جگہ....'' میں رکا، ..... ''یہ گھر بھی نہیں۔''

''یہ تو آباد ہے ہی نہیں۔ اس گھر سے جانے والا ہندو کوئی منتر کر کے گیا تھا۔ ہم یہاں ایک پریشان سی زندگی گزار رہے ہیں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ کسی امیر ہندو کا گھر تھا اور امیر لوگوں کے گھر اُن کی طرح لاتعلق ہوتے ہیں، اُن پر کوئی منتر نہیں کیا ہوتا۔

''محفوظ ہوگی وہ جگہ؟'' اُس کی آواز میں پریشانی تھی۔

''یہاں سے تو محفوظ ہوگی؟'' میں نے آوازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے میری طرف ایسے دیکھا کہ میرے ساتھ اتفاق کر رہی ہو۔

جین مندر میں جانے کے لیے مجھے خاصی تفصیل میں منصوبہ بندی کرنا پڑی۔ میں نے شہزاد کو بتایا کہ گھر والے مندر دیکھنا چاہتے ہیں اور اُس نے مجھے چابی دے دی۔ عنبر برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اُسے بازار کا چکر لگوایا تاکہ وہ سبزی کی دکانوں، سیڑھیوں اور مندر کو دیکھ کر اپنا خوف دور کر سکے۔ میں سبزی والے دکان دار کی نظر بچا کر تالہ کھولا اور سیڑھیاں چڑھ کے آخری پائدان پر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ

اعتماد سے چڑھتے ہوئے میرے پاس رکی۔ تیزی سے چڑھنے کی وجہ سے اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اُس کے گال تمتمار ہے تھے۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ وہ کافی دیر تصویروں میں گم کھڑی رہی، میں اُس کی حیرت کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ یہاں مجھے ملنے آئی تھی لیکن جین مت نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا تھا، اُس نے مندر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ پوجا والے کمرے میں آتے ہی کچھ خوف زدہ اور کچھ حیران اور متجسس سی چاروں طرف دیکھتے ہوئے تصویروں میں گم ہو گئی۔ اُس نے یقیناً ایسی تصویریں پہلے نہیں دیکھی ہوں گی اور وہ اُنھیں دیکھتے ہوئے، میری موجودگی سے بے خبر، اُن میں کھو گئی۔ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف لے گیا جہاں سے ہم رہائش والے حصے میں چلے گئے۔ میں اُسے چار پائی پر بٹھا کر خود زمین پر بیٹھ گیا۔ نیچے بازار سے لوگوں کے گھٹے گھٹے شور، دکان داروں کی آوازوں، بائیسکلوں کی گھنٹیوں اور چھابڑی والوں کے نعروں نے مندر کی گہری خاموشی میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا جو مجھے ایک طرح کا سکون دے رہا تھا۔ نوشہرہ روڈ کا شور شاید اِس سے زیادہ بے ہنگم تھا کیوں کہ وہاں تانگوں، ریڑھیوں اور بسوں کے انجنوں اور ہارنوں کا بھی شور شامل تھا۔ عنبر تو سول لائن کے ایسے سکوت کی عادی تھی جسے غالباً توڑا ہی نہیں جاتا تھا اور یہ شور یقیناً اُس کے اعصاب پر بھاری ہوگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تا کہ ہم اُس طرف بڑھیں جس کے لیے یہاں آئے تھے۔

''ایک بات کہوں، وصی؟'' اُس نے میرے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

ہماری ملاقاتوں میں کبھی بات نہیں ہوتی تھی، ہم صرف ملتے اور پھر مجھے وہاں سے نکل جانے کی جلدی ہوتی۔ عنبر کے سوال میں مجھے ایک رومانیت کا احساس ہوا۔ میں نے بھی اُس کے ہاتھ کو سہلایا۔

''کبھی میری زندگی کے بارے میں سوچا ہے؟'' مجھے اُس کے سوال سے حیرت ہوئی، میں نے اپنی زندگی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے بی اے کے لیے اپنی حاضریوں کے کم ہو جانے کا بھی احساس نہیں تھا۔ میں اُسے کیا جواب دیتا؛ خاموشی سے اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی بھی ہوئی کہ اُس کے چہرے پر معمول کی تازگی نہیں تھی، وہ کسی اُلجھن کا شکار لگی۔

''میرا کوئی مستقبل نہیں۔'' میں نے اِس پہلو پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا یا میں ابھی اِس قابل نہیں ہوا تھا کہ ایسے معاملات پر غور کر سکوں۔ میں کیا جواب دیتا۔ ''تمھارے ساتھ یہ تعلق میرا مستقبل نہیں، یہ تو ایک فرار ہے۔'' اُس کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔ میں نے جلدی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا کہ وہ رو

تو نہیں رہی! اُس کے چہرے پر اُلجھن کے جالے تھے۔ مزید میں نے ایسے خطوط پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا، ہم تو بس ایک خاص تعلق میں بندھے ہوئے تھے۔ ''تمھارے ساتھ جسمانی تسکین عارضی فرار تو ہے لیکن میرا مستقبل نہیں۔ مجھے طلاق ہوئی جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میرا خاوند میرے جارحانہ رویے سے خوش نہیں تھا؛ بقول اُس کے گھریلو عورتیں اِس طرح نہیں ہوتیں۔ تب تک میں صرف اُس کی تھی۔ میں اُس فرسودہ سی سوچ رکھنے والے آدمی کے گھر میں جدید عورت تھی جو اُس کے دقیانوسی مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ اُسے آنکھیں بند کر کے لیٹنے والی عورت پسند تھی۔'' مجھے لگا کہ وہ کچھ حاصل کرنے اور نا کرنے کے درمیان والی خالی جگہ پر بیٹھی اپنے لیے کچھ سوچنے کی کوشش میں ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اُس آدمی کے ساتھ ساجھے داری کرنا چاہتی ہے، جس کا ابھی تک اپنا ہی مستقبل نہیں۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ ایک وقت ختم ہونا ہے۔ تم نے تو شاید اِس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔'' وہ صحیح کہہ رہی تھی، میں نے اِس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور نا ہی نوید کے بارے میں۔ کیا میں عنبر کو نوید کے بارے میں بتا دوں؟ میں کچھ خائف سا ہو گیا؛ شاید کسی وقت وہ ابا کو بتا دے جو یقیناً اماں جان کے علم میں ضرور لائیں گے۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔

ہم اُسی طرح ہاتھ تھامے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ میرا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اُس کے ایسے ایک ٹک دیکھنے سے قدرے گھبراہٹ بھی ہوئی لیکن میں اُس کے خیالوں کے سلسلے کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ''میں سوچتی ہوں کہ مجھے لذت کے بجائے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یہاں آ کر میں نے اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ محسوس کیا۔ میں ایسے کب تک چل سکتی ہوں۔ جب تم اُکتا گئے یا تمھیں اپنی ہم عمر لڑکی مل گئی تو میں بھی کوئی اور مرد تلاشوں گی؟ یہ کب تک چلے گا؟ میں نے طے کیا ہوا ہے کہ شادی نہیں کروں گی۔'' میرے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ دوسری شادی ہو سکتی ہے۔ میں نے اب اُسے اور نظر سے دیکھا۔ وہ مجھے اُتنی جوان نا لگی جتنی پہلی مرتبہ ابا کو دیکھتے ہوئے لگی تھی۔ مجھے اچانک نوید کا خیال آیا: کیا بالکونی میں کھڑی وہ بھی ایسے ہی ہو گئی ہو گی؟ کیا میں اُسے نظر انداز کرتا رہا ہوں؟ میں اُسے مل ہی نہیں سکتا تھا اور بالکونی میں جتنا میں اُس کے قریب ہو سکتا تھا، ہو گیا۔ میرے ذہن میں خیال کا ایک کونہ لہرایا: کیا میں اُسے یہاں لے آؤں؟ کیسے؟ وہ عنبر کی طرح کسی حد تک خود مختار عورت تو نہیں تھی۔ اگر وہ یہاں آ جائے تو میں......!

''مجھے کچھ کرنا پڑے گا!''

''کیا؟'' میں نے بغیر کسی مقصد کے پوچھ لیا۔

''اپنی زندگی کے بارے میں!'' وہ خاموش ہوگئی۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، اُس کا ہاتھ نرم اور لمس میں ٹھنڈک تھی۔ میں تو اُس کے بدن کی حدت کا عادی تھا۔ میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا تو وہ ایک بے جان جسم کی طرح میرے اوپر گر گئی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا! محسوس ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کشش کھو بیٹھے ہیں۔ ہم کچھ دیر ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے، پھر وہ مجھ سے الگ ہوئی: کچھ شرمساری اور کچھ پریشان۔ مجھے بھی شرمندگی تھی کہ میں ایک بے بس عورت کو اپنی غرض کے لیے استعمال کرتا رہا ہوں۔ کیا ابا مجھے معاف کر سکیں گے؟

''میں کوئی کام کروں گی؟'' اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیسا کام؟''

''اپنے مستقبل کے لیے، ملازمت وغیرہ۔ کسی سکول میں پڑھاؤں گی۔ ہمارے نزدیک ہی ایک کونونٹ سکول ہے وہاں پتا کروں گی۔'' مجھے لگا کہ میں ایک نئی عنبر سے ملا ہوں۔ وہ ایک دم پُراعتماد ہو گئی تھی اور یہ یقین اُس کی آنکھوں میں ٹھہر سا گیا تھا، پہلے اُس کی آنکھوں میں ہر لمحہ تاثر بدلتے تھے۔ ''تم میری مدد کر سکو گے؟'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے کولر میں بڑی والی جگہ میں سگریٹ چھپایا ہوا تھا اور موزے میں ماچس۔ میں نے سگریٹ سلگانے کا سوچا پھر تھوڑا خوف زدہ ہوا کہ مندر میں سگریٹ نوشی گناہ تو نہیں ہوگا؟ ساتھ ہی خیال آیا کہ عنبر کو میں کسی نیکی کے لیے تو وہاں لایا نہیں تھا۔ میں نے ماچس نکال کر سگریٹ سلگایا تو اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا، وہ اب اپنایت سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے بھی کسی قدر شرمساری کے ساتھ، ایک بچے کی طرح اُس کی طرف دیکھا۔ مجھے اگلا کش لینے سے جھجک سی ہوئی۔ ''لگاؤ!'' وہ شاید میری جھجک کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مسکرا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں بزرگوں والی برتری تھی۔ ہم ایک دوسرے کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک اور کش لگایا اور اُس کی طرف دھواں چھوڑتے ہوئے ہنسنے لگا۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں آنسو رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میری چھاتی میں بھی ایک گرہ سی بنی جسے کھولنے کے لیے میں نے ایک لمبا کش لیا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں ؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کسی سکول میں میرے لیے پتا کرو۔'' اُس کی آواز میں ایک درد تھا۔ مجھے ایک ذم یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے سفینہ ہوٹل میں سید قاسم محمود کے ساتھ شام منائی جا رہی تھی۔ یہ اجلاس رات تک جاری رہنا تھا اور شبّر کو سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں تھی اِس لیے وہ نہیں آیا لیکن مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ میں اکیلا ہی چلا گیا اور میری وہاں ملاقات اقبال غوری سے ہوئی جو سینٹ جوزف ہائی سکول کے اُردو سیکشن میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ مجھے ایک معقول آدمی لگا تھا اور میں نے اُس کے ساتھ تعلق بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک صاحبِ مطالعہ آدمی تھا اور اُس کے ساتھ تبادلہء خیال ایک خوش گوار تجربہ رہتا۔ میں کبھی کبھار اُس کے سکول بھی چلا جاتا جہاں کا طریقہ کار مجھے اُن سکولوں سے بالکل مختلف لگا جہاں میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے عنبر کے لیے اُس کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ کل سے تلاش شروع کر دوں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے اُسے بتایا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر میری ہنسی میں شامل ہو گئی۔ میرے اُس کے ساتھ تعلق میں ایسی شدت رہی تھی جس سے میں آشنا نہیں تھا۔ اُس تجربے نے مجھے ایسے جہان سے واقفیت دلائی جسے وہی جان سکتا ہے جو ایسے تعلق سے دوچار رہا ہو۔ میں اپنے بدن میں کہیں دبے ہوئے لطف سے شناسا نہیں تھا اور وہ اُس کان کن کی طرح تھی جو ہیرے کی تلاش میں کھودے ہی چلا جاتا ہے۔ میں نے پھر اُس کی طرف دیکھا، وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اِس طرح بیٹھے ہوئے وہ مجھے ایک ایسا مجسمہ لگی جسے مجسمہ ساز نامکمل ہی چھوڑ گیا ہو۔ وہ شاید ابھی اپنی تکمیل نہیں کر پائی تھی کہ اُس کے اندر یہ تبدیلی آ گئی۔ کیا وہ میری تکمیل کا سبب بنی تھی؟ جین مندر میں پجاری کے کمرے میں بیٹھے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود ایک سادہ اور معصوم عورت تھی!

ہم رات کا کھانا آٹھ بجے تک کھالیا کرتے تھے کیوں کہ اُس کے بعد ابا نے اگلے پندرہ منٹ

ایسے انہماک سے خبریں سنی

ہوتی ہیں جو خبریں سنانے والے انور بہزاد یا شکیل احمد کو بھی شرمندہ کردیں۔ اُس رات ہم نے کھانا دیر سے کھایا، اُس کی وجہ ابا ہی تھے۔ وہ خبریں سننے کے لیے بھی نہیں آئے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر سوچا کہ جو بھی ہوا اُس میں میرا ارادہ شامل نہیں تھا، حالات نے رُخ ہی ایسا دھار لیا کہ میں پکے ہوئے پھل کی طرح عنبر کی جھولی میں جا گرا۔ اگر وہ ابا کو بکواس قسم کے مشاعرے میں نا دیکھ رہی ہوتی تو میں شاید اُس کی موجودگی سے بھی بے خبر ہوتا۔ ابا کو کیا برا لگا تھا؟ میرا دھوکہ یا عنبر کی بے وفائی؟ ممکن ہے کہ دونوں ہی نا ہوں اور یہ میرا وہم ہو۔ ابا کے کمرے میں سے دیر سے آنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اُن کی طبعیت بھی خراب ہو سکتی تھی یا ویسے ہی وہ باہر نا آنا چاہتے ہوں اور میرا خوف اپنے تخیل میں اُسے کئی چہرے دے رہا ہو۔

ابا جب آئے تو خبریں ختم ہو چکیں تھیں اور ہم اماں جان کے ساتھ غیر اہم سی باتوں میں اتنا مشغول تھے کہ کسی نے بھی خبروں پر توجہ نہیں دی۔ ہم جو باتیں کر رہے تھے اتنی اہم تھیں کہ ہم میں سے کسی نے اُن باتوں کو بھی نا یاد رکھا۔

ابا نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے، ہم سب کو دیکھا اور بات شروع کی۔ ''آج کی کوئی نئی خبر؟''

انھوں نے اُمید سے بھری آواز سے پوچھا۔

''خبریں نہیں سنیں۔'' اماں جان نے مختصر سا جواب دیا۔

''سنی چاہئیں!'' ابا کسی قدر تلخی سے بولے۔ مجھے اُن کی آواز میں مایوسی کا احساس ہوا۔ آٹھ بجے کی خبریں ہمارے گھر میں اُتنی ہی اہم تھیں جتنا صبح چائے پیتے ہوئے شیو کرنا۔ میں تھوڑا سا پریشان ہوا کہ ایسا بے ضرر سا اختلاف شدید جھگڑے میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ ہم عموماً ایسے جھگڑوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے لیکن اُس دن میں کچھ تلخ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا اور دخل اندازی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''دنیا قائم ہے وصی کے ابا!'' اماں جان نے ہلکا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے طنز کیا۔

''اِس نے قائم ہی رہنا ہے، اِس کے وجود پر تم یا میں اثر انداز نہیں ہو سکتے لیکن اِس کے باوجود خبر رکھنا ضروری ہے۔'' ابا کی مایوسی گہری ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کرسی میں ایسے ہلے کہ اُٹھ جانا چاہتے ہوں لیکن بیٹھے رہے۔ میں اُن کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن شاید کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اُسی وقت اماں جان اُٹھیں اور اُنھوں نے چھوٹوں کو بھی اشارہ کیا۔ میں ابا کے پاس اکیلا بیٹھنے سے خائف تھا اِس لیے میں اُٹھ کر نلکے پر جا کر ہاتھ دھونے لگا اور پھر باورچی خانے میں چلا گیا۔ اماں جان کھانا نکال رہی تھیں اور وہاں ہلکی پھلکی خوش گوار سرگوشیوں میں کوئی بات ہو رہی تھی جو میرے داخل ہوتے ہی بند ہو گئی۔ اُن تینوں کے بیچ ہمیشہ کچھ نا کچھ چلتا رہتا جو ابا کے یا میرے آتے ہی موقوف ہو جاتا۔ کھانا ٹرے میں رکھا گیا جسے ایک بھائی نے اُٹھایا جب کہ دوسرا گلاس اور پانی کا جگ لیے باہر چلا گیا۔ ہم جب بیٹھے تو ابا اپنی کرسی پر اونگھ میں چلے گئے تھے اور برتنوں کی کھٹ کھٹ، پیروں کی گھسڑ گھسڑ، باتوں کی چڑ چڑ سے چونک کر جاگے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ چند لمحے بے یقینی سے سب کے چہرے دیکھتے رہے اور پھر اُنھیں احساس ہوا کہ وہ کہاں ہیں اور ایک شرمندہ سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر پھیل گئی۔ کھانا خاموشی مگر بغیر کھچاؤ کے کھایا گیا اور میں نے اپنی بھوک اور دال گوشت کے ذائقے سے لطف اُٹھایا۔

'' میاں! پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' میں اپنی کرسی میں سمٹ گیا لیکن چھپنا ممکن نہیں تھا۔ شاید وہ بدلہ لے رہے تھے لیکن میری فیس اور اخراجات اُنہیں کی ذمے داری تھی اِس لیے مجھے ایسے سوالات سے گھبرانا نہیں چاہیے تھا۔

''ٹھیک ہے۔اب امتحانات کی تیاری ہے۔''میں نے کچھ کہنا ضروری جانا۔

''اِس یونیورسٹی کا تو نہیں معلوم لیکن ہمارے ہاں یہ اہم دِن ہوا کرتے تھے۔''اُنھوں نے اپنے دنوں کو یاد کیا۔

''میری یونیورسٹی پرانی ہے اور اِس کا نظام برصغیر میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔''میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''تمھارے ابا نے جو گھڑی کی تھی!''اماں جان نے ہم دونوں کو ایک ہی وار میں نشانہ بنایا اور ہنسنے لگی۔

''برتن اُٹھاؤ بچو!''انھوں نے کسی کو کہے بغیر ہم سب کو مخاطب کیا۔میں نے اِس حکم کو غنیمت جانا اور فوراً پانی کا خالی جگ لیے باورچی خانے میں چلا گیا اور وہاں سے دیوار کے سائے کو استعمال کرتے ہوئے سیڑھیاں پھلانگتے اپنے کمرے میں پناہ لی۔میں نے اپنا وہاں موجود نا ہونا ظاہر کرنے کے لیے بتی نہیں جلائی اور پنکھا چلا کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

میں نے صبح جب اقبال غوری کے ساتھ بات کی تو اُس نے میری طرف غور سے دیکھا تھا:

''خان صاحب!کوئی چکر تو نہیں؟''وہ ہنس نہیں رہا تھا۔

''میری ایک بیوہ عزیزہ ہیں۔''یہ تھا بھی سچ اور میں نے مزید تفصیل بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔اقبال غوری سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''اُردو سیکشن میں جنرل سیکشن کی ایک سیٹ خالی ہے۔میں فادر سے بات کروں گا اور اگر زیادہ مستحق مسیحی اُمیدوار نا ہوئی تو آپ کی عزیزہ کی نوکری ہو جائے گی۔''

''آپ بھی تو نوکری کر رہے ہیں؟''میں نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں عیسائی ہوں۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔نام اور بات چیت کی وجہ سے وہ کبھی مسیحی نہیں لگا تھا۔وہ پادریوں کا ہمیشہ مذاق اُڑاتا اور اپنے محدود تجربے کی وجہ سے میں نے اُسے کبھی عیسائی نہیں سمجھا تھا۔''وعدہ نہیں لیکن کوشش کی وجہ سے آپ کی عزیزہ ملازمت سے محروم نہیں رہے گی۔''

میں عنبر کی طرف سے قدرے مطمئن تھا لیکن ابا اپنے معاملات کو مجھے زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہوئے لگے۔عنبر اور میرے درمیان میں رشتے کے اختتام نے مجھے کسی حد تک ذہنی طور پر آزاد کر دیا تھا لیکن

کیا وہ ابا کو اپنے جالے میں اُلجھائے ہوئے تھی؟ اُن کی خط و کتابت سے تو میرا اندازہ تھا کہ یہ تعلق ابھی کاغذ اور روشنائی سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا۔ عنبر نے میرے متعلق ابا کو لکھ کر اُنھیں شک میں ڈالنے کے ساتھ شرمساری اور اذیت میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ وہ نا صرف مجھے ناپسندیدگی سے دیکھ رہے ہوں گے، خود سے بھی کئی سوالات پوچھتے ہوں گے جو اُنھیں اپنی نظر میں یقیناً زیادہ غیر اہم بنا دیتے ہوں گے۔ اماں جان اور ابا نے ہمیشہ ہمیں غیر پیچیدہ زندگی گزارنے کی تلقین کی تھی لیکن ابا خود اپنی ہی تعمیر کی ہوئی پیچیدگی میں اُلجھ گئے تھے۔ کیا میں اُنھیں اُن کی اِس پیچیدگی سے نکال سکتا ہوں؟ کیسے؟ کیا میں اُن کے ساتھ اِس معاملے میں تبادلہ ٔ خیال کروں؟ یہ ممکین نہیں تھا اور پھر مجھے کہیں پڑھا ہوا ایک فقرہ یاد آ گیا کہ ہر مشکل ایک وقت کے بعد اپنا حل خود ہی تلاش کر لیتی ہے؛ مجھے کسی حد تک اطمینان ہو گیا اور سگریٹ کی شدید طلب تلے دبے دبے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جہاں عنبر نے اپنے راز کو مجھ پر وا کر دیا تھا، نوید ابھی تک ایک گہرے اسرار کی طرح مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ کیا اِس کی وجہ دوری تھی؟ اگر عنبر مجھے برآمدے سے ہی اپنا رقعہ دے کے فارغ کر دیا کرتی اور ہم جین مندر نا جاتے تو شاید میں ابھی تک نامہ بری کر رہا ہوتا! عنبر نے اپنے جسم کی لذت سے مجھے آشنا کر کے کسی حد تک نوید کو گہنا دیا تھا لیکن اب پھر وہ پوری آب و تاب سے چمکنے لگی تھی۔ کیا وہ میرے ساتھ جین مندر جا سکے گی؟ اُس نے مجھے کسی بھی طرح سے چھت پر بلانے سے منع کیا ہوا تھا جب کہ آج میں اُسے ملنا چاہتا تھا۔ میری حالت اُس چڑیا جیسی تھی جو اپنے بچوں کے لیے جب دانا لے کر گھونسلے میں آئے تو گھونسلہ گرایا جا چکا ہو۔ میں نے سوچا کہ اُسے آواز دے کے بلا لوں، پھر خیال آیا کہ وہ مجھے اکثر بتاتی کہ اُس کا باپ ایک سخت مزاج آدمی ہے اور وہ اُسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ قدرے بلند آواز میں فلم ''میلہ'' کا گانا شروع کر دوں جسے سنتے ہی نرگس بھاگی چلی آتی تھی یا کاش میں کسی فلمی ہیرو کی طرح ماؤتھ آرگن بجا سکتا جو اُسے بلانے کا سبب بنتا۔ کیا میری سیٹی کی آواز اُس تک پہنچ سکے گی؟ میں نے خود کو اُس بے گھر کتے کی طرح محسوس کیا جو کسی کی ڈیوڑھی کے سامنے بیٹھا دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہوتا کہ وہ اندر گھس کر روٹی کا ٹکڑا دبوچ سکے۔ میں اُٹھ کر بالکونی میں جا کے نیچے دیکھنے لگا، گلی میں اندھیرا تھا اور اُس اندھیرے میں بھی مجھے ایک زندگی کا احساس ہوا۔ کیا عنبر مندر کے پوجا والے کمرے کی ہیبت سے خائف ہو کر دور ہو گئی تھی یا وہ طے کر چکی تھی کہ ہمارے درمیان میں فاصلہ ہی اچھا تھا! مجھے بار بار اُس کا اِس طرح کنارا کرنا کیوں کھٹک رہا تھا؟ کیا میں چاہتا تھا کہ ہمارا تعلق ایسے

ہی جاری رہے؟

یہ بے یقینی اور نیچے گلی میں پھیلا گہرا اندھیرا میرے اندر بھی تاریکی بھر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اُس گہرے اندھیرے کی طرح ہلکا محسوس کیا جو ہر روشنی کے گُل ہونے کے انتظار میں ہو۔ عنبر گُل ہو چکی تھی اور مجھے اچانک محسوس ہوا کہ اُس کے ساتھ کوئی وابستگی نا ہونے کے باوجود میرے اندر اُس کے لیے ایک تعلق یا پیوستگی کی ہلکی سی لوٹمٹماتی تھی؛ میں شاید چاہتا تھا کہ وہ گُل نہ ہی ہو۔ لیکن کیا میں اُسے گُل رکھنا چاہتا تھا؟ میں وہاں اُس ماں کی طرح کھڑا تھا جو اپنی بیٹی کی لاش کی آنکھیں بند نہیں کرنے دیتی کہ وہ اُسے دیکھ رہی ہے۔ میں وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھا اور موجود نا ہوتے ہوئے بھی موجود تھا۔ میں وہاں ایک عجیب سی کیفیت میں کھڑا تھا؛ میں نے ایک لمبی سانس لی اور بے خیالی میں وہ سیٹی بجائی جو شکاریوں کی زبان میں ایک بلاوا تھا۔ میں نے حکم عدولی یا وعدہ خلافی کی تھی اور جب ایک مرتبہ یہ ہو گیا تو میں نے پھر سیٹی بجائی اور اُس سانپ کی طرح اندھیرے میں بیل کے اندر دیکھنے لگا جو شاخ سے لپٹا ایک بار مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہاں کھڑے ایک جنم بیت گیا ہے۔ جین مندر میں، مَیں ابھی کل ہی گیا تھا اور مجھے لگا کہ میں کسی نئے جنم کا حصہ ہوں۔ تبھی پتوں کی سرسراہٹ نے مجھے چوکنا کر دیا۔ میں اندھیرے میں کچھ دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن مجھے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے پھر وہ سانپ یاد آ گیا جو شاخ سے لپٹا مجھے دیکھتا تھا۔ گلی میں آباد دونوں گھروں کی اُلجھنوں سے ورا ایک سیٹی کے تین حصے میری سماعت سے ٹکرائے اور میں نے جواب میں وہی سیٹی بجائی؛ گو اُس میں پرانے ریکارڈ کی گھسائی کی آواز شامل تھی۔ وہ ہنسی اور میری جان میں جان آئی۔

''سیٹی کیوں بجائی؟'' اُس کی آواز میں ہمیشہ کی طرح ہنسی کی کھنک تھی جسے مَیں سنتے ہی چلے جانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں شنکر جے کشن کی بھیرویں میں بنائی ہوئی طرزیں گھوم گئیں۔

''تمھیں بلانا جو تھا!'' میں نے جواب دیا۔

''یاد کر لیتے تو آ جاتی۔'' اُس نے مجھے ایسے جنگل میں لا کر چھوڑ دیا تھا جہاں درختوں کے تنے بھی کانٹوں کے تھے اور اُن کانٹوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا میں بھی کانٹے جڑے ہوئے تھے۔ اندھیرا اچانک یخ بستہ لگ رہا تھا جیسے سائبیریا کی برفوں کے اوپر سے پھسلتا ہوا آیا ہو۔ مجھے اپنی ٹانگیں برف کی بنی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں کس کو حقیقت کے قریب مانوں؟ کانٹوں کے جنگل یا سائبیریا سے آتی یخ بستہ

ہواؤں کو؟

''یاد تو ہر قدم پر کیا لیکن تم تک پیغام نہیں پہنچا۔'' میں نے برف کے پہاڑوں میں سے کانٹے اور یخ ہواؤں کو جدا کر کے اپنے نقطہء نظر کی حدت پر زور دیا۔ وہ یقین کے جنگل کے دوسری طرف بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں ابھی عورت میں تبدیل نہیں ہوئی لیکن کہا جاتا ہے کہ بعض معاملات میں عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔'' اُس کے لہجے میں طعنہ تھا۔ مجھے لگا کہ ہم دونوں کے درمیان میں عنبر اُس گہرے کنویں کی طرح موجود ہے جس کا پانی پیتے ہی ایک گہری نیند غلبہ پا جاتی ہو۔ میں غالباً ابھی تک اُسی نیند کے غلبے تلے تھا۔

''تم ناکام ہو گئی ہو کہ ابھی تک عورت میں تبدیل نہیں ہوئیں!'' میں نے ہنستے ہوئے ایسے کہا کہ شکست تسلیم کر رہا ہوں۔

''عورت کبھی ناکام نہیں ہوتی، صرف طریقہ بدلتی ہے۔'' اُس کے لہجے میں جارحیت نہیں تھی ۔ مجھے لگا کہ یہ اُس نے مجھے سمجھانے کے لیے کہا ہے۔ ہر عورت کی طرح شاید وہ سمجھتی تھی کہ مرد انھیں نہیں سمجھتے، میں غالباً عورت کو نہیں سمجھتا تھا۔ اُس لمحے مجھے، عنبر اور اُس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ کیا نوید نے بھی طریقہ بدل لیا تھا؟

'' کیسے؟'' میں تھوڑا سا خائف بھی تھا۔ میرے ذہن میں اپنی طرف دیکھتا ہوا سانپ گھوم گیا۔ مجھے لگا کہ وہ سانپ میری طرف دیکھتے ہوئے میرا تمسخر اُڑا رہا ہے۔ میں نے سامنے دیکھا، وہ یقیناً کسی شاخ کے ساتھ لگی اُس سانپ کی طرح میری طرف دیکھ رہی ہو گی؟ میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ وہ سانپ اُسے ڈس بھی سکتا تھا۔

''اُس کے اندر ایک اور عورت ہوتی ہے جو دراصل اداکارہ ہے جو کوئی کردار نبھاتی ہے۔'' میں نوید کو ایک کم عقل اور گھریلو قسم کی سادہ سی لڑکی سمجھتا تھا؛ مجھے شمر کی بات سچ معلوم پڑی۔ 11 کیا وہ میرے ساتھ جین مندر جا سکے گی؟

''تمھارے اندر کون سی اداکارہ ہے؟'' میں نے اپنی آواز کو جتنا ہلکا پھلکا رکھ سکتا تھا، رکھا۔ میں اُس کی ہنسی کی ہلکی ہلکی آواز سن سکتا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ دل چسپی سے ہنس رہی تھی یا میرا

مذاق اُڑا رہی تھی۔ مجھے اپنی پسندیدہ اداکاراؤں کے وہ تمام انٹرویو یاد آ گئے جن میں اُنھوں نے اپنے کرداروں پر گفتگو کی تھی اور ہر اداکارہ کا اپنا نقطہ نظر تھا۔ کچھ اپنے کردار میں خود کو گم کر دیتی ہیں اور کچھ کردار اپنے پر حاوی کر دیتی ہیں۔نوید نے کیا کیا ہوگا؟

''جو تمھیں پسند کرتی ہے۔'' ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے باپ سے ملتا ہے۔'جناب! میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' کیوں؟' وہ آدمی نوجوان سے پوچھتا ہے۔'اس لیے کہ میں اُسے پسند کرتا ہوں۔' آدمی سوچتے ہوئے مسکراتا ہے،'اگر تم کہتے کہ میری بیٹی سے محبت کرتے ہو تو میں تمھیں گھر سے نکال دیتا۔ محبت عارضی بھی ہو سکتی ہے، چاہت مستقل ہے۔' پھر وہ سنجیدگی سے نوجوان کی طرف دیکھتا ہے،' مجھے منظور ہے۔' مجھے نوید کے جواب نے کسی حد تک لاجواب کر دیا۔

''شکریہ!'' میں نے اعتراف کیا۔

''شکریہ۔'' اُس نے جواب دیا۔

''ناول؟'' میں نے فقرہ مکمل نہیں کیا۔

''ہاں!'' اُس کے جواب میں ہنسی کا عکس تھا۔

''میں تمھیں ایک جگہ دکھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ ہونا مناسب سمجھا۔

''کون سی جگہ ہے؟'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''جین مندر!'' میں نے تمہید سے اجتناب کیا۔

''کہاں ہے یہ مندر؟'' اب وہ متجسس تھی۔ میں نے جگہ بتائی۔

''مسجد والی گلی کے پاس! میری ایک سہیلی وہاں رہتی ہے اور میں گھر والوں کی اجازت سے کبھی کبھار وہاں جاتی ہوں۔'' اُس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ میں ہمیشہ نوید کے ساتھ بات کرتے ہوئے وقت کی قید سے آزاد ہو جاتا تھا جب کہ عنبر کے ساتھ ملاقات کے دوران میں مجھے جلد از جلد کھسک جانے کی جلدی ہوتی۔ میں اُس کی غیر سنجیدہ باتوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سنتا اور لطف اندوز ہوتا۔ اُس نے مندر کو دیکھنے سے انکار نہیں کیا تھا لیکن وہاں جانے کی حامی بھی نہیں بھری تھی۔ مجھے نا اُمیدی میں ڈوبی ہوئی ایک اُمید نظر آئی۔ میں اُس کے انکار کرنے یا اقرار کے انتظار میں تھا، اِس کے ساتھ میں نے اپنی خواہش کو جتنا بھی غیر اہم ہونا ممکن تھا، اُتنا ہی بنایا۔

''ناول؟''میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔میں نے ایک چکر دینے کے بعد بات کو وہیں لے جانے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں!''اُس نے اپنی ہنسی کی بوچھار میں مجھے نہلا دیا۔

''پچھلا پڑھ لیا؟''

''ہاں!''اُس کا مختصر جواب ہر تاثر سے خالی تھا۔میں کچھ متذبذب سا تھا کہ اِس جواب کا کیا مطلب لوں۔وہ کچھ دیر پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ ہر عورت کے اندر ایک اداکارہ ہوتی ہے۔کیا یہ مختصر جواب ایک اداکاری تھی؟

''اور چاہیے؟''میں گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔مجھے محسوس ہوا کہ اُس کے جواب نے ہماری گفتگو کو ایک طرح سے رکاوٹ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا کیوں کہ کئی موڑوں کے بعد بعض اوقات راستہ بند ہوتا ہے۔چند لمحوں کی وہ خاموشی مجھے خوف زدہ کرنے لگی تھی۔اُس کی ہنسی Huming Bird کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔مجھے اپنا خوف پرندے کی پرواز میں شامل ہو کے ہوا میں تحلیل ہوتے لگا۔

''ہاں!''اب اُس کی آواز میں لاتعلقی تھی۔میں اِس بار سمجھ گیا کہ اداکارہ اپنا کردار نبھا رہی ہے؛وہ زیادہ پُر جوش اور متجسس نظر آنا نہیں چاہتی تھی۔مجھے اُس کے اداکارہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔مجھے قدرے مایوسی بھی ہوئی اور ساتھ ہی اچانک پرواز لینے والے پرندے کی طرح یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ جوش اور تجسس دکھانا اُسے اخلاقی کمزوری لگا ہوگا۔کیا میری دی ہوئی ایسی کتابیں پڑھنا اخلاقی کمزوری نہیں تھا؟

''پرانی لوٹا دینا !''میں گفتگو میں وقفہ نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

''ہمیشہ کی طرح ؟''شاید وہ بھی بات کیے جانا چاہتی تھی۔

''ہمیشہ کی طرح!''

وہ ہنسی۔مجھے اِس ہنسی کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔ہم تو گفتگو کے دھاگے کو ٹوٹنے سے بچنے کے لیے دھاگہ جوڑے رکھنا چاہتے تھے۔شاید اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔پھر وہ خاموش ہوگئی۔

''میں راتوں کو جاگنا چاہتی ہوں۔''میں اُس کی بات سے پریشان ضرور ہوا لیکن وہ ایسے ہی

حیران کرتی رہتی تھی۔ مجھے اُس کا ایسے پریشان کر کے دبے دبے قہقہوں میں گم ہو جانا پسند بھی تھا۔

''کیوں؟'' میں نے اپنی آواز میں سے حیرانی کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ کیا میں بھی اداکار بن گیا تھا؟

''راتوں کو جاگنے کا اپنا ہی مزا ہے۔'' اُس نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔

''اچھا ؟''

''ہاں! آسمان کو دیکھتے جاؤ۔ تاروں کا جال اور راتوں کی خاموشی میں اپنی سانسوں کی آواز کو سنتے جانا ایک الگ دنیا کا نظارہ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ چھاتی کے اندر میں نہیں کوئی اور ہے۔ پھر ایک دم ہر طرف اندھیرا ہو جاتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ ابھی کہیں سے جن بھوت نکل کر پوری کائنات کو نگل جائیں گے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سانس لیتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں اُس خوف میں ایک لذت محسوس کرتی ہوں۔ تم اُس وقت کیا کرتے ہو؟'' اُس کی آواز میں سنجیدگی کی گہرائی تھی۔

''اندازہ لگاؤ؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں اقبال نجومی ہوں جو دلوں کے حال جان سکوں۔'' وہ ابھی تک سنجیدہ تھی۔

''میں تب سو جاتا ہوں۔'' میں اب بھی ہنس رہا تھا۔

''اوہ ! مایوس کن !'' اُس کی آواز میں بھی مایوسی تھی۔

''کیوں کہ وہی وقت سونے کا ہوتا ہے جب جن بھوت کائنات کو نگلنے کے لیے نکلے ہوتے ہیں اور مجھے سانس لینے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ میں اُسی نیند میں لطف محسوس کرتا ہوں۔'' ایک طرح سے میں اُسے چڑا بھی رہا تھا۔ کیا بتاتا کہ میں کئی راتیں اپنے ہی خیالوں میں گم کرسی پر نیم دراز ،سوتے ہوئے جاگتا تھا یا جاگتے ہوئے سوتا تھا۔ میری پریشانی میں کسی قسم کی رومانویت نہیں تھی۔

''کبھی میری طرح جاگ کر رات کا مزا تو لینا !'' وہ اب ہنس رہی تھی۔

''اور کبھی سوتے ہوئے جاگنے کا مزا بھی لے کر دیکھنا۔'' میں بھی ہنس رہا تھا۔

''اچھا ؟''

نوید کسی بھی وقت بتائے بغیر غائب ہو سکتی تھی اُس سانپ کی طرح جو اپنی زبان لہراتے ہوئے مجھے دیکھتا تھا۔

''جب اپنی سہیلی کو مسجد والی گلی میں ملنے جاؤ تو جین مندر دیکھو گی ؟''

''دیکھنا چاہوں گی ۔''اُس کے جواب میں مجھے نا ہی تو کسی قسم کا وعدہ نظر آیا اور نا ہی انکار؛ مجھے وہاں صرف اداکارہ اپنے گیٹ اپ میں دکھائی دی۔ پتوں میں سرسراہٹ سنائی دی اور پھر ایک ایسی طویل خاموشی جس میں جن بھوت کائنات کو نگلنے کے لیے نکلتے ہیں!
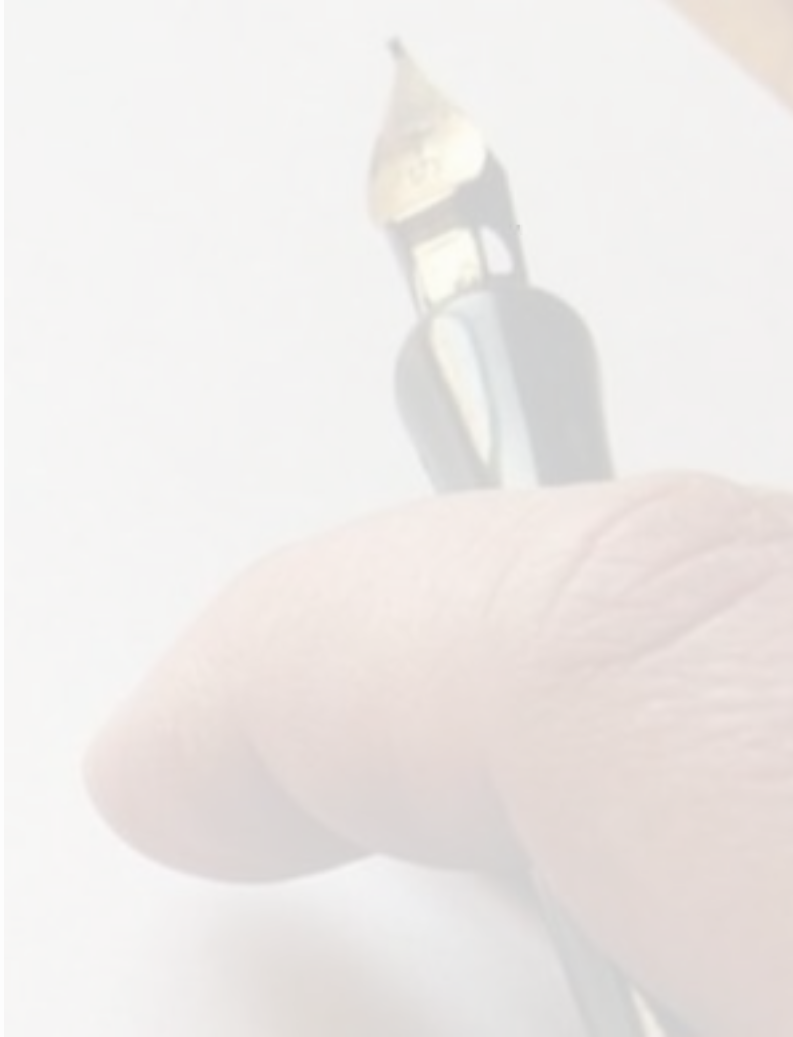
ہم صبح معمول کے مطابق صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ابا ڈاڑھی مونڈتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ باہری دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب گھر میں کوئی ملاقاتی یا عزیز نہیں آتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر میں باہری دروازے پر دیکھنے کے لیے گیا، وہ چند قدم مجھے ناختم ہونے والا فاصلہ لگا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے مُڑ کر صحن کی طرف دیکھا، اُس بچے کی طرح جو نئے سکول میں داخلے کے بعد پرانے کو نا بھولا ہو۔ ابا کی نظر مجھے آگے بڑھنے کے لیے اُکساتی محسوس ہوئی۔ اماں جان خالی نظر سے میری طرف دیکھ رہی تھیں، مجھے لگا کہ اُنھیں آنے والے میں کوئی دل چسپی نہیں جب کہ میرے بھائیوں کے چہرے پر تجسس نقش تھا۔ مجھے ہر فرد کے چہرے کے مختلف تاثرات دیکھنا دل چسپ لگا۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو میری حیرت کی انتہا نا رہی اور پھر یہ حیرت، خوف میں تبدیل ہوگئی۔ کیا میرے بالکونی عشق کی خوشبو صحنوں تک پھیل گئی ہے؟ میرے سامنے خواجہ محبوب کھڑے کسی سوچ میں گم تھے۔ اُنھیں اِس طرح خیالوں میں گم دیکھ کر میرے ذہن نے تیزی کے ساتھ سوچ کے کئی زاویے بنائے۔ پھر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جو کسی بھی طرح نوید جیسی نہیں تھی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر، مسکراتے ہوئے، صحن کی طرف بڑھ گئے۔ ابا نے اُنھیں آتے دیکھ کر نا گوار سامنہ بنایا جب کہ اماں جان اُسی طرح بیٹھی، خالی نظر سے اُنھیں آتے دیکھتی رہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی نے فوراً اپنی کرسی خالی کی اور باورچی خانے میں جا کر اماں جان کے اشارے کا انتظار کرنے لگا۔

خواجہ محبوب کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میں نے سوچا کہ کبھی آپ سب سے ملاقات نہیں ہوئی تو سلام کے لیے حاضر

ہو جاؤں۔" اُنھوں نے اپنی بھاری آواز میں، بغیر تمہید کے بات شروع کی۔ "آپ سب کو اِس طرح اکٹھے بیٹھے دیکھ کر اچھا لگا۔ واہ جی!" ابا خاموشی کے ساتھ ڈاڑھی کھرچنے میں مصروف رہے۔ اب اُن کے چہرے پر ناگواری کے بجائے دل چسپی اور آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ وہ کچھ ٹھوس کھائے بغیر چھالیا نہیں کھاتے تھے ورنہ یقیناً چند دانے منہ میں ڈالتے۔ پہلے وہ ہم سب سے مخاطب تھے، اب وہ اماں جان کی طرف مُڑے، "بہن جی!" وہ ذرا رُکے، "میں آپ سب کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔" ابا اور اماں جان ایک دم محتاط ہو کر بیٹھ گئے اور چھوٹا بھائی اور میں متجسس سے خواجہ محبوب کی طرف دیکھنے لگے۔ "واہ جی!" اُنھوں نے دہرایا، "ہم دونوں گھر کچھ عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں، ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ وہ جی کہتے ہیں کہ ہمسائے ماں باپ جائے تو ہماری ایک دوسرے کے ساتھ مخالفت بھی نہیں۔" وہ تھوڑا سا ہنسے، سب سے چھوٹا بھائی مایوس سا باورچی خانے سے باہر آ کر اماں جان کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ خواجہ محبوب نے اُسے سرسری سا دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم کچھ دیر مل بیٹھیں اور آپ ہمارے ساتھ کل دوپہر کا کھانا کھائیں۔" وہ خاموش ہوئے اور کچھ جھجکے، "ہم مل کر امبرسری کھانے کھائیں گے۔" میں ابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہاں بے یقینی سی تھی۔

"کیا فرمایا آپ نے؟" ابا نے کسی حد تک حیرانگی سے پوچھا۔ میں اُن کی بے یقینی اور حیرانگی کی وجہ کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ پیشتر اِس کے کہ کوئی ناخوش گوار سی بات ہو، میں فوراً بیچ میں بول پڑا:

"اِن کا مطلب امرتسر کے کھانے ہیں۔"

"جی خان صاحب!" وہ تھوڑا سا مسکرائے۔ اُن کی مسکراہٹ نرم اور میٹھی تھی۔ کیا نوید کی مسکراہٹ بھی ایسی تھی؟ "بچے نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ دراصل جی امبرسر، لاہور اور کوزران والا کے کھانے باقی پنجاب سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے کھانے کے شوقین ہوتے ہیں اور اِسی شوق کی وجہ سے کھانے بنتے بھی لذیذ ہیں۔" اُنھوں نے وضاحت کی۔

"دیکھو میاں!" ابا نے مجھے مخاطب کیا، "ہر علاقے کے کھانے اور اُن کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے جسے کھانے والے ہی بناتے ہیں۔ کلکتہ میں کھائے جانے والے چاول یہاں کھائے جانے والوں سے مختلف ہوتے ہیں، سندھ والے یہاں کے چاول کو پسند نہیں کرتے۔" وہ خواجہ محبوب کو میری معرفت جواب دے رہے تھے۔ "چناں چہ ہم ذائقوں کو قید نہیں کر سکتے۔"

''بھائی صاحب! ہم آئیں گے۔'' اماں جان نے ابا کی بحث کو ختم کر دیا۔ اُن کے لہجے میں مٹھاس اور اپنائیت تھی۔ اُنھوں نے ابا کی طرف نہیں دیکھا، ''بھائی صاحب! چائے پینا پسند کریں گے آپ؟''

''بہن جی! ہم لوگ تو چائے تب ہی پیتے ہیں جب بیمار ہوں۔ میری بیٹی جو چار جماعتیں پڑھ گئی ہے، چائے پیتی رہتی ہے۔ ہم تو دودھ، دہی اور لسی پینے والے لوگ ہیں۔'' انھوں نے خوش مزاجی سے کہا۔ ابا کے چہرے پر ناگواری تحریر تھی۔ خواجہ محبوب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابا نے ٹانگوں پر رکھا ہوا تولیہ ہٹایا اور وہ بھی سیدھے ہو کر اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ خواجہ محبوب کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف چل پڑے، ابا اپنی جگہ پر ہی کھڑے رہے اور میں اُن کے پیچھے دروازہ بند کرنے چل پڑا۔ خواجہ محبوب دروازے میں ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر گلی یاد کر کے گلا صاف کرتے اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

میں دروازہ بند کر کے جب اپنے صحن میں آیا تو اماں جان اور ابا میں بحث چل رہی تھی۔

''تم اپنی تہذیب اور تمدن کو کہاں تک بچاؤ گے؟ ہمارے پڑوسی دعوت دے رہے ہیں اور نا جانا انتہائی بد اخلاقی ہے۔ کل اُنھوں نے ہی ہماری کسی مشکل میں کام آنا ہے۔ تم نہیں جانا چاہتے مت جاؤ، میں تو جاؤں گی۔'' اماں جان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ ابا کو دیکھے جا رہی تھیں اور ابا مجھے کھچاؤ میں لگے۔

''پہلی بات کہ مجھے خواجہ صاحب کا دعوت دینے کا انداز پسند نہیں آیا......''

''وہ چڑیا گھر سے ہاتھی منگوا کے اُس پر سوار آتا۔'' اماں جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی اور ابا کھسیانے سے ہمیں ہنستے ہوئے دیکھنے لگے۔ ''ایسے ہی دعوت دی جاتی ہے۔ وہ ہمارے گھر تشریف لایا اور ہم نے زور دے کر چائے کی پیشکش بھی نہیں کی۔'' اماں جان اب سنجیدہ اور غصے میں تھیں۔ میں نے اُنھیں کم ہی اس طرح دیکھا تھا۔

''وقت لے کے آنا چاہیے تھا۔'' ابا کے احتجاج میں شدت نہیں تھی۔

''اُس نے اپنے عام سے پڑوسی کے بجائے لاٹ صاحب سے ملنے آنا تھا کیا؟''

''اپنے گھر میں ہر کوئی لاٹ صاحب ہی ہوتا ہے۔''

''میں کل جا رہی ہوں، بھلے اکیلے ہی کیوں نا جانا پڑے۔''

''ہے تو غلط لیکن اگر تم سب جاؤ تو میرا نا جانا مناسب نہیں۔ میں بھی چلوں گا۔'' ابا نے شکست تسلیم کر لی لیکن اُن کے چہرے پر ناخوش گواری کی تحریر واضح طور پر پڑھی جاتی تھی۔ ابا کی رضامندی نے ہم تینوں بھائیوں کو آرام سے کر دیا۔ میرے چھوٹے بھائی تو خواجہ محبوب کے گھر ایک تبدیلی اور تفریح کے لیے جا رہے تھے لیکن میرا مقصد نوید کو نزدیک سے دیکھنے کا تھا اور اگر ممکن ہو سکا تو اُس کے ساتھ کوئی بات کرنا بھی میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں اگلے دن کے طلوع ہونے کا اُسی وقت سے منتظر ہو گیا۔ میں نوید کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے کے تاثرات میں بھی دل چسپی تھی کیوں کہ میں تو صرف اُس کی آواز سے ہی چہرے کے تاثرات تعمیر کرتا رہا تھا۔ ممکن ہے اُس کے تاثرات وہ ہوں ہی نا جو میں نے گھڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک بچوں والی بے قراری تھی جو مجھے بے چین کیے جا رہی تھی۔

میں بہت باریکی کے ساتھ استری کی ہوئی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھا، ساتھ میں نے پتلون کے رنگ کی جرابیں اور چمکتے ہوئے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہم جب باہری دروازے کی دہلیز پار کر کے صحن میں داخل ہوئے تو مجھے گھر میں کسی قسم کے شور یا غیر ضروری آوازوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ اُن کے تین کمرے ایک قطار میں لگے جن کے سامنے ایک برآمدہ تھا جس میں سے سیڑھیاں پہلی منزل کو جاتی تھیں۔ برآمدے میں چند کرسیاں پڑی تھیں اور اُن کے سامنے ایک میز رکھی تھی۔ ہم ابھی صحن میں ہی تھے کہ خواجہ محبوب ایک کمرے میں سے خاصی تیزی کے ساتھ برآمد ہوئے۔ وہ کل والے لباس میں ہی تھے اور اُن کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔

''خان صاحب! آپ نے میری بہت عزت کی۔ بہن جی! میں آپ کی یہ مہربانی ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' اُن کی آواز میں خلوص تھا اور وہ سامنے سے اپنی قمیص کے گھیرے کو کھینچ جا رہے تھے جو اُن کی بے چینی کا بھی مظہر تھا۔ مجھے ایسے ہی خیال گزرا کہ شاید اُنھیں ہمارے آنے کی توقع نہیں تھی اور اب ہمیں دیکھ کر اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اماں جان سے بات کر کے اُنھوں نے ہماری طرف دیکھا اور اپنائیت سے مسکراتے ہوئے ہم تینوں کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اُس مصافحے نے ماحول کو کافی حد تک کھچاؤ سے پاک کر دیا۔ وہ سیدھے چلتے ہوئے کرسیوں تک گئے اور ہمارے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ابا بھاری قدموں سے چلتے وہاں تک پہنچے تو خواجہ محبوب نے اُنھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اماں جان چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے، مسکراتے ہوئے، کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''تم لوگوں کو دعوت نامہ چاہیے؟'' اُنھوں نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے تو کسی دعوت نامے کی ضرورت نہیں تھی، میری نظر نوید کے دزدیدہ کھوج میں تھی۔ اُسی وقت خواجہ صاحب کی بیگم ایک کمرے سے برآمد ہوئیں۔ وہ بھاری جسم کی، سرخ و سفید عورت تھیں؛ اُن کا قد لامبا اور نقش باریک تھے۔ وہ اماں جان کی طرف دیکھ کر خوش مزاجی سے مسکرائیں، اماں جان بھی جواب میں مسکراتے ہوئے اُٹھیں اور گلے ملیں۔ ابا اُن کو ملتے ہوئے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی اُٹھے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر خوش مزاجی سے مسکرائے۔ اِس عرصے میں تینوں کے درمیان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کی بیگم نے ہمارے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور میرے دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ناگواری کے ساتھ اپنے اپنے بال درست کیے۔ مجھے نوید کی ماں یا اُس کے باپ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی؛ میں گھر کے کسی کونے میں سے نوید کی آواز سننا چاہتا تھا، اُس کے قدموں کی آہٹ کو اپنے کانوں میں سجانا چاہتا تھا، اُس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا یا اُس کی خاموش سی موجودگی کو اپنے آس پاس محسوس کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر ہم سب ہی وہاں بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مجھے ابا اور اماں کے انداز سے لگا کہ خواجہ محبوب کسی کھڑکی یا جھروکے کے پیچھے سے ہمیں جھانک رہے ہیں ور اُسی وقت خواجہ محبوب مسکراتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے، اُن کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔ میں نے سوچا: کیا نوید ہر وقت اِسی لیے مسکراتی ہے؟

''خان صاحب! ہمیں یاد نہیں رہا یا ہماری غلطی سمجھیں، آپ کو گھر کی بہت مبارک ہو۔'' اُنھوں نے ابا کو مخاطب کیا۔

''عنایت ہے آپ کی، نوازش۔ میرا نقطہ نظر بہت واضح تھا۔ یہ گھر کسی کو الاٹ نہیں ہوا تھا، میرے پاس جائز کلیم تھا اور میں یہاں رہ رہا تھا سو یہ مجھے ہی ملنا چاہیے۔'' ابا نے خواجہ صاحب سے پہلی مرتبہ کھل کر بات کی۔ اُنھیں شاید محسوس ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب اور اُن کے درمیان میں کوئی مشترک موضوع ہی نہیں اور اب جب گھر کا ذکر ہوا تو وہ کھل گئے۔ ویسے بھی ایک بے گھر کے لیے گھر کا مالک بن جانا معمولی بات نہیں تھی۔

''ہم لوگ بھی بہت خوش ہوئے۔ آپ لوگ اچھے پڑوسی ہیں بالکل ویسے کہ جیسے ہمیں چاہئیں۔''

اماں جان مسکرائیں اور ابا کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولیں: ''آپ کو کیسے پڑوسی چاہئیں؟'' اُن کی آواز میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ اماں جان کے سوال سے میں تھوڑا سا کھچاؤ میں آ گیا۔ مجھے لگا کہ کسی کے گھر میں بیٹھ کر ایسے ذاتی سوالات نامناسب ہیں!

''وہ پڑوسی جو ہمسایوں کے معاملات میں دخل نا دیں۔ امبر سر میں مسلمانوں کا ایک محلہ ہوتا تھا شریف پورہ۔ وہاں ہمارے ایک ہمسائے تھے جن کے ساتھ ہماری رشتے داری بھی تھی اور ہم خدا جانے کب سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہمارے ایک دوسرے سے کوئی راز بھی نہیں تھے لیکن اُنھیں ہمیشہ ہماری پریشانی رہتی۔'' خواجہ صاحب اتنی بلند آواز میں ہنسے کہ میں چونک سا گیا۔ ابا بھی اپنی حیرت نا چھپا سکے۔ ''اُنھیں ہمارے باورچی خانہ کی جاسوسی میں زیادہ دل چسپی تھی۔'' اُسی وقت خواجہ صاحب کی بیگم بھی آ گئیں۔ وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

''بھابھی جان! اُنھیں بس یہی غم کھائے جاتا کہ ہم دوپہر کو کیا پکائیں گے اور رات کو کیا؟ وہ بس یہی پتا لگانے کی کوشش میں رہتے جو اُنھیں پسند نہیں تھا......'' خواجہ صاحب نے اُن کی بات کاٹی:

''میں نے اِسے بتایا ہوا تھا کہ جو بھی پکاؤ اُنھیں ضرور بھیجو......''

''اور ہم بھیجتے بھی تھے...'' اب اُنھوں نے خواجہ صاحب کی بات کاٹی، ''لیکن وہ پھر بھی جاننے کی کوشش میں ہوتے کہ اگلے وقت ہم کیا پکائیں گے۔'' اب وہ بھی ہنس رہی تھیں۔

''ہم عورتوں میں یہ عادت ہوتی ہے۔'' اماں جان نے رائے دی، ''شاید اِسی لیے ہم عورتیں بنائی گئی ہیں۔''

اُسی وقت مجھے عجیب سی آواز سنائی دی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں وہ آواز یہاں برآمدے میں کرسی پر بیٹھا بھی سنوں گا۔ میں نے حیران اور خوف زدہ ہو کر سب کے چہروں کی طرف دیکھا لیکن سب اردگرد سے بے نیاز باتوں میں مصروف تھے اور کسی نے میرے اندر آئی تبدیلی محسوس نا کی۔ جو میں نے سنا وہ سیٹی کی آواز تھی۔ کیا وہ مجھے بلا رہی تھی یا اُس نے صرف اپنے وہاں موجود ہونے کا بتایا تھا؟ میرا جی چاہا کہ میں بھی سیٹی کا جواب دوں لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ شاید اُس کے گھر والے اِس سیٹی سے مانوس ہوں۔ اُسی وقت نوید گلاسوں والا ٹرے اُٹھائے آئی اور خاموشی کے ساتھ میز پر رکھ کے واپس چلی گئی۔ مڑنے سے پہلے اُس نے میری طرف دیکھا، ہماری نظر ملی، اُس کی آنکھیں چمکیں، گالوں پر سرخی دوڑ گئی

اور ہونٹوں کے کنارے کپکپائے۔ یہ ایک لمحہ مجھے پوری زندگی لگا، ایسی زندگی جو کائنات سے بھی وسیع اور گہری ہے۔ میرے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اور جب میں خود پر قابو پا چکا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ کیا یہی زندگی تھی جو ناموجود اور موجود کے درمیان میں لٹکی ہوئی تھی؟ تبھی وہ سٹیل کا ایک بڑا سا جگ اُٹھائے آن موجود ہوئی۔ اُس نے پہلا گلاس بھر کے اماں جان کو دیا، دوسرا ابا کو اور پھر دونوں بھائیوں کے گلاس بھرے اور غالباً جگ خالی ہو گیا تھا کیوں کہ وہ واپس مڑی اور ایک بار پھر ہماری نظر ملی۔ اُس کی آنکھیں دھندلی، چہرہ بے تاثر، ہونٹ بھینچے ہوئے جیسے کسی کے ساتھ متنازع گفتگو کے بعد کسی سوچ میں ہوں۔ میں نے پلک جھپک کر اُسے سلام کیا۔ اُس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی کا ایک جھپاکا ہوا، گال تمتمائے اور ہونٹوں کے کنارے کپکپائے۔ واپس مڑنے سے پہلے اُس نے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور پلکیں جھپک کر میرے سلام کا جواب دیا؛ مجھے اپنے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ کا احساس ہوا، کسی بچے کے ہاتھ کی لگائی لکیر کی طرح جسے صحیح طور سے دیوار پر دیکھا نا جا سکے۔ میرے ہونٹوں پر ابھی مسکراہٹ کی لکیر مدھم نہیں ہو پائی تھی کہ وہ وہاں نہیں تھی۔ مجھے اب اُس کے واپس آنے کا انتظار تھا جیسے مجھے اُس کے ہر دفعہ نئے روپ میں آنے کی عادت تھی۔ اگلے لمحے وہ بھرا ہوا جگ لیے آن کھڑی ہوئی اور میں اپنے گلاس کے بھرے جانے کا منتظر تھا لیکن ایسے ہوا نہیں۔ اُس نے پہلے اپنی ماں کا گلاس بھرا اور پھر باپ کا گلاس بھرنے کے بعد میرے گلاس میں سفید، گاڑھا اور جھاگ دار محلول ڈالا۔ گلاس بھرتے وقت اُس نے ہونٹوں کو سیٹی بجانے کے انداز میں کیا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں جھکی ہوئیں اور گال تمتما رہے تھے۔ وہ ایک ارتکاز کے ساتھ میرے گلاس کو بھر رہی تھی، شاید اُسے خدشہ تھا کہ اُس کے ہاتھ کپکپا نا جائیں۔ میں نے ایک جھجک کے ساتھ اپنا ہاتھ گلاس کی طرف بڑھایا اور ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اوپر کو اُٹھتا ہوا میرا ہاتھ کپکپایا، میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی، مجھے لگا کہ سب میری طرف دیکھ رہے ہیں اور گلاس کو گرنے سے بچانے، ابا کی ناراضی سے بچنے، اماں جان کے طعنے سننے سے جان چھڑانے، خواجہ محبوب اور اُس کی بیوی کو کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی ایک گھونٹ میں آدھا گلاس ختم کر دینا چاہیے۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی طوالت کا یہ دورانیہ زندگی سے بھی مختصر تھا۔ میں نے گلاس ہونٹوں سے لگایا، اُس کی نظر مجھ پر نہیں تھی۔ میرا ہاتھ وہیں رُک گیا، شاید وہ میری طرف دیکھنا ہی بھول گئی تھی، شاید وہ مجھے یاد رکھنا ہی نہیں چاہتی تھی، شاید وہ بھول گئی تھی کہ بھولنا اِتنا

آسان نہیں، شاید وہ یاد رکھنا ہی چاہتی ہو لیکن کسی بھول کی وجہ سے بھول گئی ہو۔ میں نے گلاس کے اوپر سے اُسے دیکھا، مجھے گریگری پیک اور آڈرے ہیپبرن یاد آ گئے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظر میں انتظار تھا؛ کس چیز کا انتظار؟ بالکونی میں ملاقات کا؟ کیا سامنے بیٹھنے والوں کا انتظار کیا جاتا ہے؟ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی نظر میں انتظار تھا! وہ مجھے دیکھ رہی تھی جب کہ وہاں دوسرے لوگ شریف پورہ میں ہونے والے قتل و غارت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو میں وہاں سے ہجرت کر کے آنے والوں سے کئی بار سن چکا تھا۔ میرے بھائی بھی اُن باتوں میں غرق تھے۔ نوید مجھے دیکھ رہی تھی، شاید اُس نے بھی وہ باتیں کئی مرتبہ سنی تھیں اور چاہتی تھی کہ وہ باتیں ہوتی رہیں اور وہ میری طرف دیکھتی ہی رہے۔ میں نے دیکھا کہ باقی لوگ گلاس خالی کر کے میز پر رکھ چکے تھے اور میں نے ابھی تک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا، بلکہ میرا گلاس ہونٹوں تک ہی پہنچا تھا۔ کیا گلاس کا ہونٹوں تک کا سفر اتنا طویل ہوتا ہے جتنی میری سوچ؟ سوچ کا کوئی انت نہیں ہوتا، وہ بس چلتی ہی جاتی ہے؛ سوچ کی طرح۔ اور کیا نوید بھی کسی سوچ میں گم تھی اور اُسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ شاید دیکھنا ایک غیر ارادی عمل تھا جب کہ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھی۔ پھر وہ مسکرائی، اُس نے اپنی مسکراہٹ چھپائی نہیں اور مسکراتے ہوئے اُس کی نظر جھکی ہوئی تھی۔ شاید وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے میں جھجک محسوس کر رہی تھی لیکن مسکرانا بھی ضروری تھا ،اُس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی تھی اور وہ زبردستی کا ہونٹوں پر لہرا جانے والا ، مسکراہٹ کا عکس نہیں تھا۔ اُس نے نظر اُٹھائی ، ہماری نظریں ملیں اور اُس کے چہرے پر شرماہٹ کی سرخی پھیل گئی۔ اُس کے چہرے پر خاموش سی معصومیت تھی جب کہ عنبر مجھے ہمیشہ کسی مقصد کے حصول میں منصوبہ بناتی محسوس ہوتی تھی۔ میں بالکونی میں نوید کی سوچ کے نتیجے میں چہرے پر آنے والے عکس نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن یہاں ہر تبدیل ہوتا عکس ریل گاڑی کے ساتھ بھاگتے سایوں کی طرح تھا۔ ہمیں مندر میں ایک ملاقات ضرور کرنی چاہیے۔ مجھے یاد آیا کہ مندر کی چابی میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھی ہوئی ہے۔ مجھے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آئی۔ گجرانوالا میں جینوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کی چابی میرے پاس تھی اور میں اُس عبادت گاہ کو عشقیہ ملاقاتوں کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ کیا ہندوستان میں مسجدیں بھی ایسے کام کے لیے استعمال ہوتی ہوں گی؟ کیا دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے مذاہب کی یہی توقیر تھی؟ کیا گرجے اور گوردوارے بھی اِسی کام کے لیے استعمال ہوتے ہوں گے؟ کیا عشق اور مذہب ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے

میں نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر نوید کی طرف دیکھا، وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی؛ کیا اُس نے گلاس میں کچھ ملا تو نہیں دیا تھا؟ اور اب وہ میرے گھونٹ لینے کے بعد میرے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتی ہو۔ میرا ہاتھ رکا اور پھر میں نے ایک احتیاطی گھونٹ لیا۔ میں نے کسی حد تک شرمندگی کے ساتھ نوید کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک آنکھوں کی اُسی چمک کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈی، میٹھی، گاڑھی اور خوش ذائقہ لسّی کا گھونٹ بھرا تھا جو غالباً تھانے والے بازار سے آئی تھی۔ اور میں نے ایک ہی ڈیک میں سارا گلاس ختم کر کے باقی گلاسوں کے ساتھ رکھ دیا۔ نوید نے ایک لمبی سانس لی اور وہ کمرے میں جا کر جگ بھر لائی؛ ہم تینوں بھائیوں کے علاوہ کسی نے دوسرا گلاس نہیں لیا۔ اُسی وقت نوید کا بڑا بھائی بھی وہاں آ گیا اور خالی کرسی نا پا کر کمرے سے اپنے لیے ایک موڑھا لے آیا اور نوید ایک پیڑھا لا کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں اُس کے چہرے کو ایک ہی طرف سے دیکھ سکتا تھا۔ اُس کا آدھا چہرہ مجھے ایک مجسمے کی طرح لگ رہا تھا تاوقتیکہ وہ ہل جاتی کیوں کہ باتیں سنتے ہوئے وہ مسلسل ایک چہرے سے دوسرے کی طرف اپنے چہرے کا رخ کر رہی تھی۔

اب شریف پورہ سے گفتگو نوشہرہ روڈ پر آ گئی تھی۔ ابا کو سرکلر روڈ پر تانگوں اور ریڑھوں کی بے ہنگم قسم کی بھیڑ سے شکایت تھی کہ وہ پیدل چلنے والے کے لیے مشکلات پیدا کرتے تھے اور خواجہ صاحب انھیں سمجھا رہے تھے کہ وہ اُردو بازار میں سے ہو کر جہاں جانا چاہیں چلے جایا کریں۔ ابا اُردو بازار کبھی نہیں گئے تھے اور زیدی صاحب کے پاس جانے کے لیے ہمیشہ سرکلر روڈ سے ہی جاتے۔ ابا کچھ بے چین ہونا شروع ہو گئے تھے؛ اُسی وقت نوید کی والدہ اور اُس کے درمیان میں اشاروں کی زبان سے کوئی بات ہوئی۔ اُس کی والدہ نے اماں جان کی بات سنتے ہوئے نوید کی طرف دیکھا، دونوں کی نظر ملی۔ دونوں کے درمیان میں آنکھوں نے اپنی زبان میں کچھ بات کی جسے میں تو نہیں سمجھ سکا۔ نوید نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لیے کوئی پیغام نہیں تھا اور نا ہی میں نے کوئی پیغام دیا۔ وہ خاموشی سے اُٹھی اور کسی کی طرف توجہ دیے بغیر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ خواجہ محبوب مسلسل بات کیے جا رہے تھے۔ اُن کی باتوں کے درمیان میں اُن کی بیگم بھی اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

میرے بھائی خواجہ محبوب کی باتیں نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ اُنھوں نے غالباً کسی کو اِس طرح باتیں کرتے نہیں سنا تھا۔ گھر میں تو ہمیشہ کام کی بات کی جاتی اور زیادہ بولنا جاہلوں کا چلن سمجھا

جاتا۔ ابا سارا دن خاموش بیٹھ سکتے تھے، وہ صرف اُس بات کے کرنے میں یقین رکھتے تھے جس کا زندگی پر کوئی اثر ہو۔ خواجہ محبوب کی باتوں میں ابا کے نظریے کی کہیں جھلک نہیں تھی، وہ بس ایک ٹک سے بولے چلے جارہے تھے۔ ابا ایک مرحلے تک اُنھیں غور سے سنتے رہے، پھر اُنھیں خواجہ صاحب کی گفتگو میں یکسانیت محسوس ہونے لگی۔ اماں جان کو خواجہ صاحب کی باتوں سے اپنے معمول میں ایک تبدیلی کا احساس ہوا؛ وہ، ابا اور ہماری باتوں سے کسی حد تک اُکتائی بھی ہوئی تھیں۔ شاید ہمیں کسی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ گھر میں ہماری زندگی ایک طے شدہ معمول کے گرد ہی گھومتی تھی۔

خواجہ صاحب کے ہونٹوں کے کنارے لعاب سے تر تھے جنھیں قرہ زبان سے صاف کرتے رہتے اور وہ اپنی کسی کمی کو پورا کرنے کے لیے بولے جارہے تھے، یا اُن کا خیال تھا کہ خاموش رہنا گھر کی کسی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ اُن کا لہجہ، بات کرنے کا انداز اور بات ختم کرکے سب کے چہروں کے تاثرات پڑھتے ہوئے اپنے کہے کی داد چاہنا میرے بھائیوں کے لیے نئی چیز تھی۔ شاید نوید کے بھائی کو باورچی خانے سے اشارہ ہوا تھا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے باپ کی بات پر مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اُن کے اُٹھنے کے بعد وہاں تھوڑی دیر خاموشی ہو گئی، شاید خواجہ محبوب کی باتوں کی روانی میں خلل آیا تھا۔ اُس وقفے کو اماں جان نے سنبھال لیا اور وہ ہجرت کے اپنے سفر کو بیان کرنے لگیں کہ اُنھیں کیسے دو بچے سنبھالنے پڑ رہے تھے۔ میں نے تو زیادہ تنگ نہیں کیا تھا لیکن ابا تو چلتے چلتے رکتے اور پھر واپس چل پڑتے۔ اُنھیں اپنے گھر کی یاد اِس طرح جکڑ لیتی کہ قدم وہیں رک جاتے۔ جب وہ لوگ ریل گاڑی میں بیٹھنے لگے تو اُنھوں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اماں نے بتایا کہ اُنھوں نے سمجھایا کہ شاید وہ گھر اب تک رہا بھی نا ہو یا وہاں کوئی اور آباد ہو گیا ہو۔ اماں نے سیٹ پر مجھے لٹایا ہوا تھا اور ابا کے ساتھ پلیٹ فارم پر بحث میں مصروف تھیں کہ گاڑی چلنے کا وقت ہو گیا۔ اماں جان نے چند لوگوں کو اشارہ کیا جو ابا کو اُٹھا کر ڈبے میں لے آئے اور ساتھ ہی گاڑی نے حرکت شروع کر دی۔

خواجہ محبوب اماں جان کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے، انہماک کی وجہ سے اُن کے ماتھے پر لکیریں اُبھر آئیں تھیں اور منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ابا اِس بار بار دہرائی جا چکی بات کو دل چسپی سے سنتے ہوئے ایک طرح سے بے زاری کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ اُنھوں نے جواب میں کوئی صفائی بھی نہیں پیش کی، بس اماں جان کی طرف اپنایت سے دیکھتے جاتے تھے۔

کھانے کی خوشبو صحن میں پھیل گئی تھی اور مجھے ایک دم پیٹ میں بھوک کی وجہ سے حرکت سی محسوس ہوئی اور یہ ڈر بھی کہ خالی معدہ کہیں کوئی آواز نا نکال دے۔ چھوٹے بھائی بے چین ہو گئے تھے اور شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ مارتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی شاید بھوک لگ گئی تھی، اُن کی باتوں میں اب اُکتاہٹ سی در آئی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ اماں جان اور ابا کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی نا کوئی بات کیے جا رہے تھے۔ اماں جان کے چہرے پر مسلسل ایک خوش گوار سا تاثر تھا، ایسے محسوس ہوا کہ وہ یہاں آ کر صحیح معنوں میں خوش ہوئی ہیں۔ میں نے اُنھیں اتنی دل چسپی اور انہماک سے باتیں سنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا؛ اپنے جاننے والوں کی ماہانہ محفلوں میں مجھے وہ ہمیشہ اُکتائی اُکتائی سی نظر آتی تھیں؛ شاید وہاں کہنے یا سننے کو زیادہ نہیں تھا اور بار بار کہا یا سنا جانے والا ہی کہا یا سنا جاتا تھا، ممکن ہے کہ یہاں کہا یا سنا جانے والا اُن کے لیے اپنے اندر دلچسپی کی کئی تہیں لیے ہوئے ہو۔ میں اماں جان کو ہمیشہ ایک سخت گیر، سمجھوتہ نا کرنے والی اور کم گو خاتون سمجھتا تھا لیکن میری اُن کے بارے میں ہر رائے غلط ثابت ہوئی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ابا کچھ کھچے کھچے سے، ناخوش اور بیچ بیچ میں خوش مزاج نظر آئے جب کہ اماں جان کا رویہ متوازی اور ہموار رہا۔ اُنھوں نے ہر بات نہایت غور سے سنی اور جہاں ضرورت پڑی، اپنی رائے بھی دی۔

خواجہ صاحب کی بیگم نے اُنھیں اشارہ کیا اور ایک مختصر سے وقفے کے بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ صاحب بظاہر ایک کھردرے، اونچے لہجے میں بات کرنے والے اور زنگ آلود سی شخصیت نظر آتے تھے جن کی باتیں دل چسپ اور گلی محلے کی دانش لیے ہوئے تھیں۔ گو میری تمام تر توجہ نوید کی طرف تھی، میں اُن کی باتیں سن بھی رہا تھا۔ ہجرت میں اُنھوں نے گو سڑک ہی پار کی تھی لیکن امرتسر اُن کی رگوں میں آباد تھا اور وہ بچپن کی یادیں اپنے مخصوص مزاج میں بیان کرتے۔ اِن لوگوں کے ہاں آ کر ایسے احساس ہوا کہ پتھریلے پہاڑ پر یک دم سبزے کی تہیں اُگ آئی ہوں۔

خواجہ صاحب نے کھڑے ہو کر قمیص کے گھیرے کو سیدھا کیا، مجھے لگا کہ وہ بات کرنے سے پہلے شرما رہے ہیں۔ وہ تھوڑا سا جھجکے، دروازے میں کھڑی بیگم کی طرف دیکھا اور اماں جان کی طرف مڑے:

''بہن جی! کھانے کے لیے تشریف لے چلیں، اُس کمرے میں جس کے دروازے میں وہ کھڑی ہے۔'' خواجہ صاحب 'وہ' کہتے ہوئے شرمائے اور اُن کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اماں جان

اُن کے اِس طرح شرمانے پر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ میں نے اُنھیں اِس طرح ہنستے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔ کیا ابا کے ساتھ اُنھوں نے گھٹ کر، کسی دباؤ کے نیچے زندگی گزار دی تھی یا وہ آج اداکاری کر رہی تھیں؟ مجھے ایک دم نوید کی بات یاد آ گئی: ہر عورت اداکارہ ہوتی ہے۔

کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی جس پر ایک سفید چادر پر کھانا سجا ہوا تھا۔ ابا ہمیشہ مرادآباد کے ایسے دسترخوان کی بات کیا کرتے تھے اور آج یہاں امبرسر والے نے مرادآبادی دسترخوان سجا دیا تھا۔ ایک قطار میں ڈونگے رکھے ہوئے تھے اور نوید ایک طرف اُبلے ہوئے چاولوں کا تھال لیے کھڑی تھی جس میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ اور شاید تھال کے وزن نے اُس کے چہرے پر لالی گھنڈ دی تھی۔ ایک لٹ ماتھے پر اِس طرح آئی ہوئی تھی کہ اُس کی ایک آنکھ بند تھی اور وہ اُسے کھولنے کے لیے پھونکیں مار مار کے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابا بیٹھنے سے پہلے ذرا جھجکے اور پھر مسکراتے ہوئے، اپنائیت کے ساتھ، بیٹھ گئے ۔اُن کی تقلید میں ہم نے بھی ڈونگوں کے گرد اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ خواجہ صاحب بیٹھتے ہی اماں جان کی طرف مُڑے لیکن مخاطب ابا سے ہوئے، ''خان صاحب! خالص امبرسری کھانے بنانے کی کوشش کی ہے اِس نے۔'' اُن کی بیگم خوشی اور تفاخر سے مسکراتے ہوئے شرما رہی تھیں۔ ''بھنا ہوا چھوٹا گوشت ہے، مرغ قورما ہے، سبزی گوشت ہے اور چھوٹے پائے ہیں۔ ہم کھاتے تو بڑے ہیں لیکن یہ آپ لوگوں کے لیے خاص کرلائے ہیں۔ کل دوپہر کے بن رہے ہیں ہلکی ہلکی آنچ پر۔ تھانے والے بازار میں ہمارا ایک مخصوص نان بائی ہے اُس سے نان لگوائے ہیں۔ شروع کریں نا بہن جی!'' اماں جان نے پلیٹ میں تھوڑا سا پایوں کا شوربا ڈالا اور ایک لقمہ توڑ کر منہ میں ڈال کے مزے کے ساتھ کھانے لگیں اور پھر پلیٹ بھر لی اور نیچے جھک کر ہم سب سے بے خبر ہو گئیں۔ مجھے نوید نے بھاپ اُڑاتے ہوئے چاول پیش کیے اور میں نے تھوڑے سے چاول ڈال کے پایوں کا سالن ڈال لیا۔

کھانے کا ذائقہ وہ تھا جس کے ہم عادی نہیں تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے گفتگو کم رہی اور سب کی توجہ اپنی پلیٹ اور ڈونگوں پر تھی۔ نوید خالی ٹرے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور جو سالن، چاول یا نان کم ہوتے، فوراً لے آتی اور سب سے پہلے مجھے دیتی بھلے مجھے نا بھی چاہیے ہو اور اپنائیت سے ایسے مسکراتی کہ مجھے اپنی بھوک ختم ہوتے محسوس ہوتی۔

مجھے ابا خاموش اور بجھے بجھے سے محسوس ہوتے تھے۔ کیا اِس کی وجہ میں تھا؟ خواجہ محبوب کے گھر اگر اماں جان حالات اپنے ہاتھ میں نا لے لیتیں تو دعوت پھیکی اور بے جان سی رہ جاتی۔ ابا وہاں اُکتائے اُکتائے اور مایوس سے نظر آئے، مجھے یوں لگا کہ اُنھیں وہاں ہونے والی گفتگو سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اب میں نے ابا کو ہر وقت غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ صبح ہم سب مل بیٹھ کر چائے پیتے، ابا ڈاڑھی بھی مونڈتے اور ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی، ابا اِس گفتگو میں حصہ تو لیتے لیکن مجھے محسوس ہوتا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہیں۔ کیا عنبر اُن کے ذہن پر سوار تھی؟ اگر اُن کا عنبر کے ساتھ کوئی تعلق تھا تو ممکن ہے کہ اُس نے اپنے ساتھ میرے تعلق کو بھی کھول دیا ہو۔ ابا اور اماں جان کے دوستوں کے گھروں میں منعقد ہونے والی محفلوں میں بھی ابا اِسی طرح خاموش بیٹھے اکثریت کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے اور کبھی اپنی رائے کا اظہار نا کرتے۔ مجھے کبھی محسوس ہوتا کہ اُن کی اِس خاموشی کا میں ذمے دار ہوں۔ پھر میں اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ جو ہوا اُس میں میری مرضی شامل نہیں تھی اور سب عنبر کے ایما پر ہوا۔ کیا عنبر کے کیے میں، مَیں برابر کا شریک نہیں تھا؟

اگر ابا بجھے بجھے سے اور خاموش تھے تو مجھے محسوس ہوتا کہ ایک چپ مجھے بھی دبائے ہوئے ہے۔ میں گھر میں ایک سائے کی طرح ادھر اُدھر پھرتا، کسی کے ساتھ بات کیے بغیر۔ میرا سب کے ساتھ پہلے بھی کم رابطہ رہتا تھا لیکن اب ختم ہی ہو چکا تھا، شاید عنبر کا سایہ گھر پر اپنی چھاؤں کیے ہوئے تھا۔ میں اِس سائے کے بوجھ سے نکلنے کا فیصلہ کر کے ایک دن سینٹ جوزف ہائی سکول میں اُسے ملنے کے لیے چلا گیا۔ اقبال غوری اپنے دفتر میں بیٹھا ملنے کے لیے آئے ہوئے والدین کے ساتھ مصروف تھا۔

''خان صاحب! انتظار کریں۔ ہاف ٹائم میں بات کریں گے۔'' اُس نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے حوصلہ دیا۔

مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے کالج میں شبر کو حاضریاں لگوانے کا کہا ہوا تھا اور ممکن تھا کہ ایک آدھ حاضری لگ جائے، ویسے شبر ایسے کام کم ہی کرتا تھا۔ میں باہر خالی گراؤنڈ کو دیکھنے لگا۔ سکول کے دونوں حصوں کی عمارتیں اُس گراؤنڈ کے ایک طرف اور دوسری طرف سامنے سڑک، جہاں سے داخلے کے دو راستے ہیں۔ میں خالی گراؤنڈ میں نظر دوڑا رہا تھا کہ عنبر ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں داخل ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا رنگ زرد ہو گیا اور مجھے وہ خوف زدہ لگی جیسے اُس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ اُس کو معمول کی حالت میں آتے وقت لگا جو ضرورت سے زیادہ تھا۔ میں اگر پھونک مارتا تو شاید وہ فرش پر گر جاتی۔ پھر اُس میں مجھے زندگی واپس آتے محسوس ہوئی۔ اُس کے چہرے پر رنگ واپس آنے لگا۔ مجھے لگا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے جاتی تھی اور میں مسکراتے جاتا تھا۔ پھر وہ اقبال غوری کی طرف دیکھ کے اپنائیت سے مسکرائی، مجھے لگا کہ اُس نے میری طرف دائیں آنکھ سے اشارہ کیا ہے جو میں دیکھ نہیں سکتا تھا کیوں کہ اُس کے چہرے کا وہ رُخ مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے ایک دم سبکی کا احساس ہوا۔ آج وہ یہاں میری سفارش کی وجہ سے تھی ورنہ ابھی تک اپنے بھائی کے گھر بیکار بیٹھی بھابی کی جلی کٹی سن رہی ہوتی۔

''غوری صاحب! اِس عورت نے میری طرف کوئی اشارہ کیا؟'' مجھے اپنے اندر کوئی اور ہستی بولتے ہوئے محسوس ہوئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کبھی کسی آدمی یا عورت پر آسیب قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ اُن کے لہجے میں اُنہی کی زبان بولنے لگتا ہے۔ کیا میرے اندر ابا کا آسیب آ گیا تھا؟ میں نے یہ بھی سنا ہوا تھا کہ آسیب ہمیشہ مرے ہوئے لوگوں کا آتا ہے۔ لیکن ابا تو ہم سب کی طرح زندہ تھے۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ تو زندوں میں شمار کیے ہی نہیں جا سکتے؛ وہ تو بس کھلی آنکھوں سے جو کہ بند تھیں، اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے، کوئی تاثر دیے بغیر، جو آدمی کے ذہنی طور پر زندہ نا ہونے کی نشانی تھی۔ مجھے اپنے زندہ ہونے کے باوجود مرے ہوئے باپ پر انتہائی ترس آیا۔ میرے باپ نے پتا نہیں اِسے کتنی شدت سے چاہا ہو. میں نے سنا ہوا تھا کہ اِس عمر کی چاہت بوڑھی ہڈیوں سے بھی زیادہ غیر لچکدار ہوتی ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے بغیر کچھ دیکھے، ہر طرف دیکھتے رہتے ہیں؛ شاید وہ اُنھیں اردگرد بکھری ہوئی نظر آتی ہو! مجھے وہ اپنے

سامنے کھڑی اُس پتھر کی طرح لگی جس پر کئی سیاہیوں سے لکھا گیا ہو۔اُن مختلف رنگوں نے اُس پتھر کا اصلی رنگ ہی چھپا دیا ہوتا ہے۔وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُس کی نظر میں اب خوف کے بجائے دل چسپی میں ڈوبی ہوئی حیرت نظر آئی۔وہ حیران کیوں تھی؟ اُس کے خیال میں اُس کے وہاں ہونے کی وجہ سے میں اقبال غوری کو ملنے نہیں آؤں گا؟ پھر وہ مسکرائی؛میں نے اُس کو اِس بے باکی سے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔وہ اُس بچے کی طرح تھی جسے جھوٹ کو سچ کرنے ڈھنگ آ گیا ہو۔پھر وہ اقبال غوری کی طرف مُڑی:

''مہمان کو چائے پلائی؟'' اُس کی بات میں ہنسی اُبل رہی تھی۔میں اِس اُلجھن میں تھا کہ وہ سنجیدہ تھی یا میرا مذاق اُڑا رہی تھی!میں خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

''مس صاحبہ! آپ بندوبست کریں۔'' اقبال غوری نے ملاقات کے لیے آئی ماں کو الوداع کرتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

عنبر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''کیوں نہیں! آپ میز پر پڑی گھنٹی تو دبائیں۔'' پھر وہ میری طرف مڑی،''میں نے تو جانا بند کر دیا ہے، مصروفیات ہی کچھ بڑھ گئی ہیں، سنا ہے ماہانہ محفلیں پھس پھسی سی ہو گئی ہیں۔'' میں کہنا چاہتا تھا کہ اُس کے نا آنے کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے لیکن پھر میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا ، مجھے یہ کہنے کا خیال بھی آیا کہ اُس کے نا آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا کیوں کہ وہ محفلیں تو پہلے ہی پھس پھسی ہیں اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ بات کر کے گنوائی کیوں جائے!

''ہاں بس!'' میں نے گول سا جواب دیا۔عنبر کبھی ایسے کھل کر ہنسی نہیں تھی اور نا ہی اُس کے لہجے میں اتنی شگفتگی تھی، میں نے اُس میں سلگتی ہوئی شہوت کے سوا کبھی کوئی اظہار نہیں دیکھا تھا۔ میں نے عنبر کی طرف دیکھا تو وہ اقبال غوری کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر میں نے اقبال غوری کی طرف دیکھا تو وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔دونوں کی نظروں میں مَیں نے ہارمونوں کو ایک طرف سے دوسری طرف سفر کرتے دیکھا، مجھے دونوں کے بیچ میں کوئی خاص تعلق لگا۔عنبر کے ساتھ تعلق میرے لیے ایک بوجھ سا بن گیا تھا، مجھے لگنے لگا تھا کہ میں نے ابا اور اپنے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور لگا کرتا تھا کہ عنبر بھی ایسے ہی محسوس کرنے لگی تھی اور مجھ سے دور ہونے کی غالباً یہی وجہ تھی۔اب مجھے لگا کہ میرا پریشان ہونا یا پچھتانا فضول تھا کیوں کہ عنبر اپنے مرد بدلتی رہتی تھی۔میں نے

اقبال غوری کو نئی دلچسپی کے ساتھ دیکھنا شروع کر دیا کیوں کہ عنبر کی مدہوش جوانی نے ہم دونوں پر عنایت کی تھی اور شاید کسی وقت بیتی ہوئی راتوں کی کسک بھی آ جائے ۔ وہ مجھے کچھ اپنا سا لگا، اُس گاہک کی طرح جو ایک ہی دکان پر خریداری کرتے ہوئے دوست بن گیا ہو۔
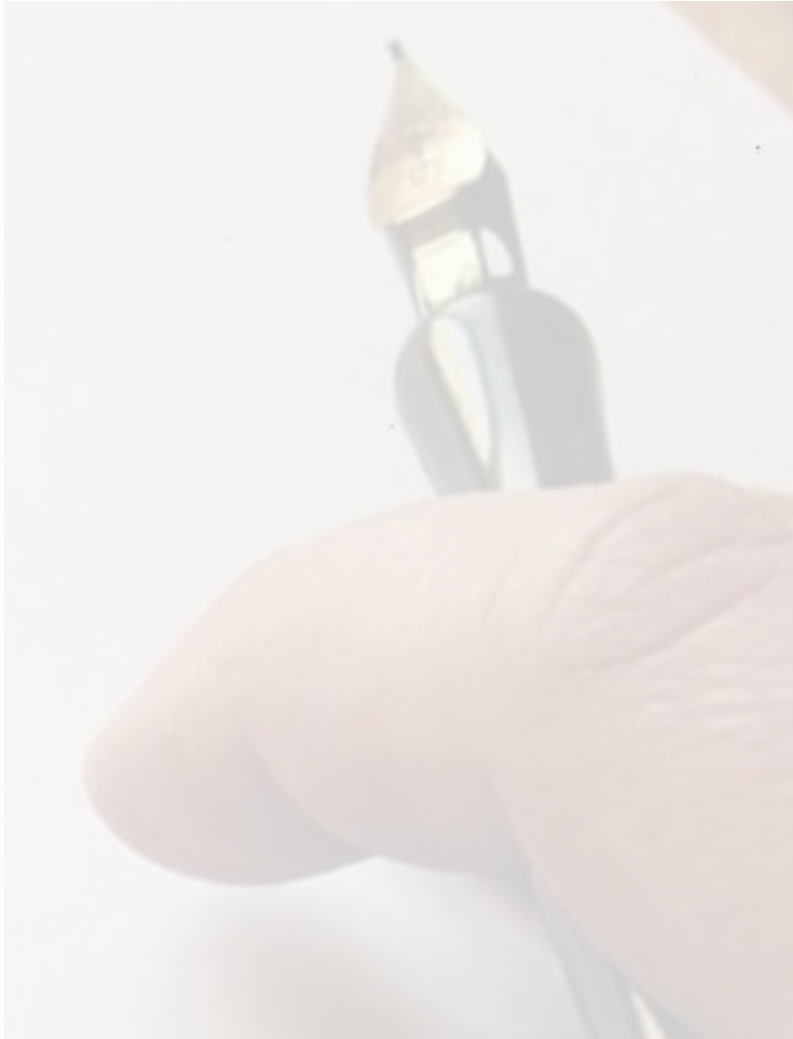
سینٹ جوزف سکول میں ملاقات کے بعد مجھے عنبر میں کوئی دلچسپی نا رہی اور شاید اِسی لیے میں نے اقبال غوری سے ملاقات بڑھا دی، صرف عنبر کو بتانے کے لیے کہ مجھے اُن دونوں کے تعلق سے کوئی سروکار نہیں۔ نوید اچانک مجھے اُس پرندے سی لگی جو طاقتِ پرواز رکھنے کے باوجود اُڑ نہیں سکتا یا اُڑنا نہیں چاہتا۔ وہ چمکتے بالوں والی اُس کبوتری کی طرح تھی جو اپنی دیوار پر بیٹھی آسمان پر اُڑتے کبوتروں کو دیکھتی رہتی ہے۔ کیا میں بلی کے آنے سے پہلے اُسے اپنی پرواز میں شامل کر سکوں گا؟ مجھے اپنا سانس گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ میں عنبر کے ساتھ اپنے تعلق کو ابا کے حوالے سے غیر اخلاقی اور نوید کو ذہن میں رکھتے ہوئے بے وفائی گردانتا تھا۔ نوید کی معصومیت مجھ پر اُن کے گھر میں آشکار ہوئی جب وہ آنکھ پر جھولتی لٹ میں سے مجھے دیکھتے ہوئے، بے بسی کے ساتھ پھونکیں لگا کر اُسے پرے کرتی تھی۔ اُس کے ایسا کرنے میں ناتجربہ کاری بھی شامل تھی۔ ایسے تو نہیں کہ وہ اداکاری ہی کر رہی ہو؟ اگر وہ اداکاری تھی تو وہ سب کی موجودگی میں مجھے ہونٹوں کے قریب گلاس کو روکے ہوئے دیکھتے دیکھتے بے جھجک مسکرا کیوں رہی تھی؟ میں مہمان تھا لیکن اُس نے مجھے لسّی کا گلاس اپنے ماں باپ کے بعد دیا۔ ایسا کرنے میں اُس نے نا صرف ایک اپنایت کا اظہار کیا بلکہ مجھے نئے ڈھنگ کی اہمیت بھی دی۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھا سامنے بیل کو دیکھ رہا تھا۔ ہر رات مجھے محسوس ہوتا کہ بیل زیادہ پھیل گئی ہے کیوں کہ وہ مجھے گلی کے اندھیرے میں ایک بلند پہاڑ کے سائے کی طرح دکھتی۔ بعض اوقات جب میں جاگ کر جاگنے کی کیفیت میں آنے سے پہلے بیل کی طرف دیکھتا تو ایک خوف کی جھرجھری مجھے جگا کر بٹھا دیتی۔ میں اُس بیل کو دیکھتا، اُس کی کسی شاخ کے ساتھ لٹکتے ہوئے سانپ کے متعلق سوچتا اور اُن شاخوں

کے درمیان میں کھڑی نوید کو ذہن میں لاتا تو میری چھاتی کے اندر ایک آتش فشاں کا سیال باہر نکلنے کے لیے چکر لگاتے ہوئے محسوس ہوتا۔نوید وہی وہانوی کے دو ناول پڑھ چکی تھی۔کیا اُن ناولوں نے اُس کے اندر کی کسی گہرائی میں نسوانی شہوت کو شعلہ دکھایا تھا؟ جو میں سوچ رہا تھا کیا نوید میری اِس سوچ کی تکمیل کر سکے گی؟ مجھے اُسے جین مندر لے کے جانا ہی ہوگا؟ کیا میں ایک عبادت گاہ میں اُسے مائل کر سکوں گا؟ میں نے اُسے تیسرا ناول دینا ہے؛ کیا وہ اُسے جین مندر میں دوں؟ مجھے اچانک خیال آیا کہ میں وہ ناول اُسے پڑھ کر سناؤں گا اور اُس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھوں گا۔یک دم مجھے اپنی سوچ مضحکہ خیز لگی۔کیا عنبر نے میرے اندر ایک بُرے آدمی کو وجود دے دیا ہے یا ایک اچھی عورت کی پہچان ختم کر دی ہے۔مجھے اپنے پر غصہ آیا اور خود سے شرمساری بھی ہوئی۔مجھے نوید کے متعلق ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔مجھے اُسے سالم ہی رکھنا چاہیے اور نا کہ توڑ کے اُس کی تکمیل کرنے کے منصوبوں پر عمل درآمد کا غور کرتے کرتے ذہن کو اُلجھنوں کے حوالے کر دوں۔لیکن میرا اُس کے ساتھ ملنا ضروری تھا۔ہم اُن دو سایوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے کو محسوس نہیں کر سکتے۔میں اُسے محسوس کرنا چاہتا تھا؛ یہ تنگ سی گلی جو میرے لیے ایک دنیا سے بھی زیادہ چوڑی تھی میں اُسے ناپنا چاہتا تھا۔کیا میں ایسے کر پاؤں گا؟ میرا جی اُسی وقت چیاں والی بنگلے پر جانے کو کر آیا۔کیا کبھی ایسا ہو سکے گا کہ میں اُسے اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں؟ میں نے سنگتروں سے بھرا جھولا بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ لٹکایا ہوا اور وہ کیریئر پر بیٹھی سنگترہ چھیل کے ایک پھانک مجھے دیتی جائے اور ایک خود کھاتی جائے۔بنگلے میں ہم نہر کے کنارے بیٹھ کر بہتے ہوئے پانی، پاپولر اور سفیدے کے درختوں میں سے گزرتی ہوا اور جھاڑیوں میں چہچہاتی چڑیوں کی چہکار کی موسیقی سنیں۔کیا یہ ایک خواب ہی رہے گا؟ اِس خواب کو پورا کرنے کے لیے مجھے اُسے حاصل کرنا ہوگا اور حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔

میرے کان کو دھوکہ ہوا تھا یا میں کسی خواب میں گم چیاں والی والے بنگلے میں پانی، ہوا اور چہکار کی موسیقی سنتے ہوئے ایک نیا ساز بھی سن رہا تھا؟ مجھے تین حصوں میں بجتی ہوئی سیٹی سنائی دی اور ہمیشہ کی طرح میرا جسم بوجھل اور بے جان ہو گیا۔سیٹی دہرائی گئی تو مجھے اپنے جاگنے کا احساس ہوا۔میں نے بیل کی طرف دیکھا تو مجھے وہ کچھ سمٹی ہوئی سی محسوس ہوئی۔میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو ستارے مجھے اشارے کرتے نظر آئے اور میں نے جب شہر کی جانب دیکھا تو وہ مجھے سکون کی گہری نیند

میں غرق لگا۔ میں اُٹھا تو مجھے اپنا آپ پھیلتے ہوئے محسوس ہوا۔ کیا میں اتنا پھیل سکتا ہوں کہ نوید تک پہنچ جاؤں؟

میں نے سیٹی کا پہلا حصہ بجایا، دوسرا اور پھر تیسرا!

میں اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور وہ بیل کے درمیان میں، سانپ کی پروا نا کرتے ہوئے، میری منتظر تھی اور میں اُس کے قہقہے کا۔ بیل میں حرکت ہوئی اور اُس نے مجھے آواز دی:

''سنو، وصی!''

''کہو؟''

''سگریٹ لگاؤ، دونوں پیتے ہیں۔'' میں سرگوشی کی روشنی میں اُس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ سکتا تھا۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

''سب سو رہے ہیں۔ وقت پتا ہے کیا ہوا ہے؟''

میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور ٹائم پیس کمرے میں رکھا پڑا تھا۔ ''نہیں معلوم۔''

''دو بجے ہیں۔''

''سچ؟''

''سچ!'' میں غالباً سو گیا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر خطرہ تو لینے لگا تھا لیکن نوید کو کش لگاتے ہوئے دیکھنے کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اچانک مجھے ایک عجیب طرح کے احساس نے جکڑ لیا۔ نوید کہیں سگریٹ پیتی ہی نا ہو! اُس کے گھر میں مل کے سگریٹ پینے کا دستور تو تھا ہی، اگر وہ سگریٹ پیتی ہوئی تو......؟ میرے پاس ایک سگریٹ اور ایک ٹوٹا تھا۔ میں نے سگریٹ نوید کو دینے کا فیصلہ کیا۔

''ٹھہرو میں لے کے آیا!'' میں جواب دیے بغیر کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں نے سگریٹ سلگائے اور ڈبیہ میں ڈال کر نوید کی طرف پھینک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سگریٹ کی روشن آنکھ بیل کے نیچے نظر آئی۔ سگریٹ اچانک جگمگایا، اُس نے کش لیا تھا لیکن وہ کھانسی نہیں۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ وہ سگریٹ پیتی ہے۔ میں نے بھی ایک چھوٹا سا کش لیا۔

''مندر کب چلو گی؟'' میں نے اپنی طرف سے اُس کے بے احتیاطی کے وقت میں وار

کیا۔ اُس نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ اُس کا سگریٹ والا ہاتھ ہلے جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی فیصلہ کر رہی ہے۔ میں نے دل میں گنتی شروع کر دی۔ میں کھچاؤ میں سے نکلنے کے لیے ایسے ہی کرتا آیا ہوں۔ گنتے ہوئے میری توجہ مسئلے سے ہٹ کر گنتی پر مرکوز ہو جاتی ہے اور میں صرف گنتا ہی جاتا ہوں۔ میرے گننے میں ارتکاز کی اتنی شدت ہوتی ہے کہ سو تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے نیند آنا شروع ہو جاتی ہے۔ آج میں سونا نہیں چاہتا تھا! اُس نے سگریٹ سے ایک بڑا سا دائرہ بنایا اور ایک کش لیا۔ یہ اُس کا دوسرا کش تھا۔

''ایک شرط پر چلوں گی۔'' اُس کے لہجے کی سنجیدگی سے میں گھبرا گیا۔ مجھے شرطوں پر کیے جانے والے فیصلوں سے ہمیشہ گھبراہٹ ہوتی تھی؛ ایسا فیصلہ دوسرے فریق کو ہمیشہ کسی امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ میں اُس امتحان سے قدرے خوف زدہ سا ہو گیا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے ایک کش لے کر دھواں اُس کی طرف چھوڑا۔

''میرے ساتھ میری دوست بھی آئے گی!'' میں نے یک دم اپنے مزاج میں تبدیلی کا ڈھونگ رچایا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ آنا چاہتی تھی اور آ بھی جائے گی۔ مجھے کوئی غلطی نہیں کرنی ہو گی۔

''نہیں۔ پھر مت آؤ۔'' میں نے اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنی آواز کی سختی پر حیرت ہوئی۔ مجھے لگا کہ سویا ہوا شہر ایک جھٹکے سے بیدار ہو کے مجھے دیکھنے لگا ہے اور مَیں خواب میں چلنے والے کی طرح کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنے راستے پر چلتا جا رہا ہوں۔ سگریٹ کے گول سفر نے اچانک میرا راستہ روک لیا۔ مجھے لگا کہ دہکتی ہوئی کئی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

''اکیلے آنا مناسب ہو گا؟'' اُس کی آواز میں احتیاط کی دانش تھی۔ مجھے عنبر اور نوید میں ایک اور فرق نظر آیا۔

''ہم نے ملاقات کرنی ہے کوئی محفل تو نہیں لگانی۔'' میری آواز میں طنز تھا۔ مجھے پلڑا اپنی طرف جھکتے ہوئے محسوس ہوا۔

''میں....'' سگریٹ نے پھر ایک چکر کاٹا ''میں ..... یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ اب میری کوئی شرط نہیں۔'' اُس کے جواب نے میری زبان بندی کر دی۔ وہ نا صرف مجھے ملنے کو آنے کے لیے تیار تھی، وہ شاید میرے......

''میں نے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔'' اُس نے میری سوچ کو کاٹا، میں نے اُس کی طرف دیکھا، بنچ کے نیچے شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بنچ سے ٹکراتی ہوا سے بھی ہلکا محسوس کیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ دن بتائے بغیر ہی چلی گئی تھی اور پتا نہیں کہ اگلی ملاقات کب ہو ؟ کیا یہ اُس کی چال تھی یا محض ایک اتفاق؟
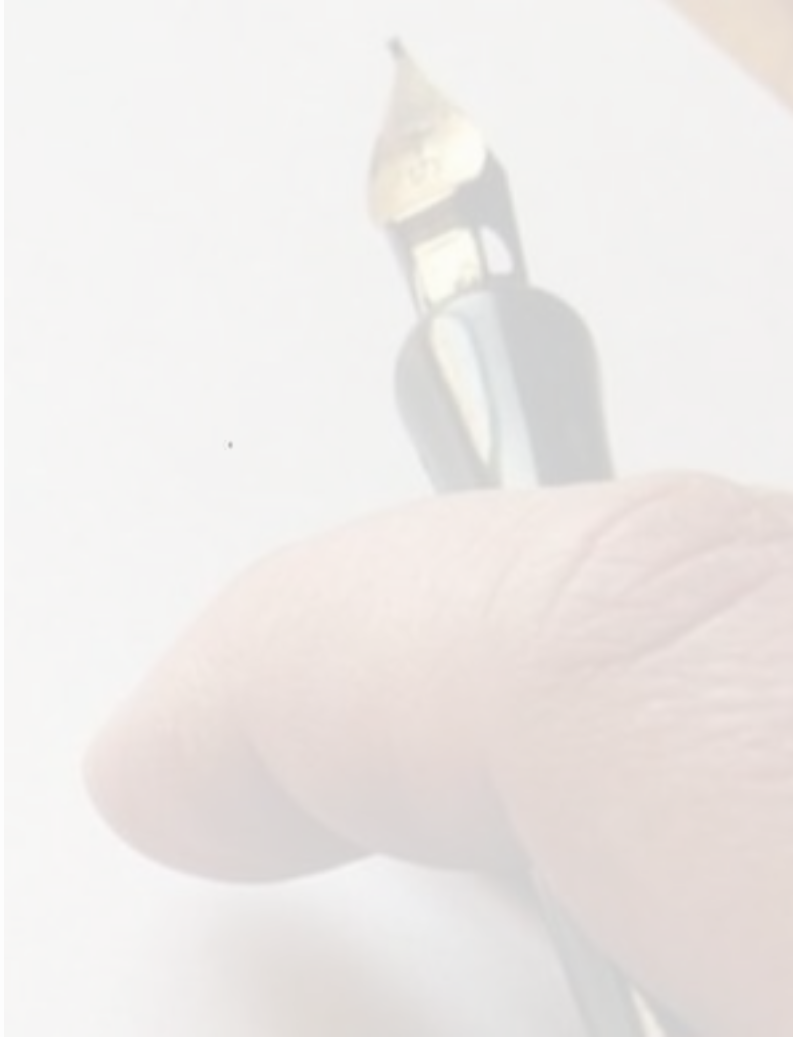
گوجرانوالا گہری نیند میں تھا اور بعض اوقات مجھے لگتا کہ شہر خواب خرامی شروع کر دے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ شہر نے اگر خواب خرامی شروع کر دی تو کیا ہوگا؟ کیا گیارہ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم ہوگا اور ہر کوئی راستے کی تلاش میں دوسرے کو جان سے مارنے کے درپے ہوگا۔ اُسی بھیڑ میں نوید بھی کہیں چلے جا رہی تھی اور میں اُس کی جستجو میں تھا۔ مجھے ایک مافوق الفطرت اور ناقابل فہم سا احساس ہوتا کہ میرے علاوہ بھی کوئی اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ کون تھا؟ میں اُس کے متعلق سوچتا رہتا۔ یہ جاننے کے لیے ایک دن میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔ وہ ٹھاکر سنگھ گیٹ کے پاس چند لوگوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ اُس نے برہمی سے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ اُس مجمع میں خوش تھی اور مطمئن بھی۔ ''میری فکر نا کرو۔ میں نکل آؤں گی۔''

''تمھارے ساتھ کون ہے؟'' میں اتنی زور سے چیخا کہ وہاں تمام شور بند ہو گیا اور ہر کوئی میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے لیے خاموشی اب نئے معنوں کے ساتھ سامنے آن کھڑی ہوئی؛ ہر طرف شور تھا اور اُس تمام ہنگامے میں مَیں لب بستہ! تیز آندھی چلنا بند ہو گئی تھی اور بعد کا حبس دم گھونٹ رہا تھا۔ مجھے اردگرد خالی عمارتوں میں سے کھڑکیاں، روشن دان اور دروازے جھانکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھر لوگوں کی باتوں کا شور اُبھرنے لگا۔

''میری حفاظت کرنے والا۔'' اُس نے ایک دبلے سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کا قد لمبا، کمر قدرے جھکی ہوئی اور ناک سے نکلی ہلکی سی رطوبت اوپر والے ہونٹ پر جمی ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں بے تاثر تھیں اور وہ بار بار کبھی نوید کو اور کبھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ نوید ایک صحت مند اور

زندگی سے بھری ہوئی لڑکی تھی اور وہ جسمانی طور پر اِس کمزور آدمی کو اپنا محافظ سمجھتی تھی۔

''اِسے تو خود حفاظت کی ضرورت ہے!'' میں نے چاروں طرف سے بلند ہوتے شور میں سے اونچی آواز میں کہا۔ اب لوگ جاگنا شروع ہو کر اپنے گھروں کی طرف چل پڑے تھے۔ اُنھیں جلدی تھی، ایسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی موت کے میلے میں سے آ رہے ہیں۔ میں جب اپنے گھر کی طرف مڑا تو خواجہ محبوب سامنے کھڑا تھا اور ساتھ میں ابا۔ میں پریشان سا اُنھیں دیکھتا تھا۔ ابا کا خواجہ کے ساتھ کھڑے ہونا ایک پہیلی تھی۔ ابا پریشان نہیں تھے۔ مجھے خوشی ہوئی اور کسی حد تک حیرت بھی! ابا کا ہر وقت پریشان اور اُلجھے ہوئے رہنا ایک معمول تھا اور جو میں نے دیکھا وہ معمول سے ہٹی ہوئی بات تھی۔ کیا مجھے ابا کا ہر وقت پریشان رہنا ہی پسند تھا؟ کیا میں ابھی تک اُن کا رقیب تھا؟ میں سامنے کھڑا اُن سے چھپنے کی کوشش میں تھا۔ مجھے شک گزر رہا تھا کہ وہ ابھی تک مجھے دیکھ نہیں سکے تھے۔ میں بھی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں وہاں کھڑا تھا اور شہر پھر سے سو گیا۔ میرے سامنے کچھ بھی نہیں تھا، ابا اور نا خواجہ محبوب! میرے ذہن میں نوید کا اب تیسرا رخ تھا۔ وہ کسی اور کی حفاظت میں جانا چاہتی تھی۔ کیا میں اُسے کسی طرح مایوس کر رہا تھا؟

میں چھت پر اپنی معمول کی جگہ پر کھڑا تھا اور سامنے بیل کے اندر نوید کھڑی تھی۔

''پریشان ہو؟'' اُس کی آواز میں اُداسی تھی۔ میں تو اُس کے قہقہے سننے کا عادی تھا، اُس کے لہجے کی اُداسی مجھے خنجر کی طرح لگی؛ میرے منہ سے اِک آہ نکل گئی۔ نوید کے والدین اُس کی منگنی کر رہے تھے، لڑکا بھی پسند کر لیا تھا اور ایک آدھ دن میں رسم ادا ہو جانی تھی۔ نوید کو اپنا ہونے والا منگیتر قطعاً پسند نہیں تھا۔ اُس کا جسم بے ڈول اور ناک میں سے ہر وقت پانی بہتا تھا۔

شام ہو چکی تھی اور مجھے چاروں طرف اُداسی پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جب اپنے کمرے میں تھا تو نوید نے معمول کی سیٹی بجانے کے بجائے مجھے آواز دی تھی جو مجھے عجیب بھی لگا تھا۔ نوید چھت پر ہمیشہ ڈری ڈری رہا کرتی تھی اور پہلے ممکن موقع پر نیچے بھاگ جاتی تھی۔ میں جب باہر نکلا تھا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں جو میرے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پھیلا دی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میں بُت بنا اُسے دیکھتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ ہم کتنی دیر اِس طرح کھڑے رہے۔

''پریشان ہو؟'' اُس نے دوبارہ پوچھا تو میں اپنے حواس میں آیا۔ میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پریشان نا ہونے والی کوئی بات ہے؟'' میں نے تلخ سے لہجے میں کہا۔ میں اُس کے ساتھ کبھی تلخ نہیں ہوا تھا اور مجھے لگا کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی ہے جیسے جھٹکے سے بچ رہی ہو۔

''دیکھو وصی!'' اُس کی آواز میں بڑوں والی ایسی سنجیدگی تھی کہ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''عورت زندگی میں صرف ایک آدمی کی ہوتی ہے۔ میں تمھیں قبول کر چکی ہوں۔ گھر والے میری شادی بھی کر دیں، میں تمھاری ہی رہوں گی۔'' مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا، میں بھی شاید نوید کو قبول کر چکا تھا لیکن ایک احساس کے بجائے مجھے تو وہ مکمل چاہیے تھی۔ میرے ذہن میں ایک دم جین مندر آیا: کیا مجھے اُسے وہاں لے جانا چاہیے؟

''دیکھو نوید!'' میں نے بھی اُسی سنجیدگی سے بات شروع کی۔ ''ہمیں کہیں مل بیٹھ کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''میرا اب گھر سے نکلنا مشکل ہوگا ورنہ میں اُس مندر میں جانے کو تیار تھی۔'' نوید نے میرے اوپر پانی کی بالٹی اُنڈیل دی۔ شاید اُس نے میرے چہرے کے تاثر کو دیکھ لیا تھا یا ابھی بات ختم نہیں کی تھی، ''میرے گھر والے ان گرمیوں میں چھت پر سوئیں گے۔ وہ یہ طے کر چکے ہیں کہ گرمیوں میں نیچے صحن میں نہیں سویا کرنا۔ میں موقع ملنے پر تمھیں اپنے ہاں بلا لیا کروں گی۔''

میرے لیے کیا ضروری تھا؟ ہمارے گھروں کے درمیان کی تنگ گلی کو بیچ میں رکھ کر نوید سے محبت کرنا یا اُسے مل کر دونوں کو آزمائش میں ڈالنا؟ کالج کی کینٹین اور بزرگ دوستوں کی اپنے دوستوں کے ساتھ بحثوں میں ابھی تک طے نہیں ہو سکا تھا کہ جسمانی ملاپ محبت کو ختم کر کے مزید شہوت جنم دیتا ہے یا محبت کے بڑھاوے کا سبب بنتا ہے؟ میں اُسے ملنا چاہتا تھا اور اپنے آپ سے خائف بھی تھا۔ کیا ہر ملاقات کا انجام بستر میں ہی ہوتا ہے؟

میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا!

پھر وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ وہ چند منٹ اتنی بھاری اُداسی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے کہ مجھے لگا کہ میں اُس کا قہقہہ بھول ہی گیا ہوں۔ میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں

نے سوچا کہ بناوٹ کے بغیر والا قہقہہ اتنا جاندار ہوتا ہے کہ وہ ماحول کے ہر بھاری پن کو اپنے بہاؤ میں بہا جاتا ہے۔ میں چند لمحے پہلے والا کھچاؤ بھول کر اُس قہقہے کے ترنم میں کھو گیا۔ میں مزاج کی اچانک تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتا تھا لیکن خاموش رہنا مناسب سمجھتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

''ہم نے.....'' وہ پھر ہنسی، اور میں کچھ اُلجھ سا گیا، کیا نوید ذہنی توازن تو نہیں کھو رہی؟ ''ہم نے صرف باتیں کیا کرنی ہیں'' وہ پھر ہنسی، ''ناول دہرانے کی کوشش نہیں کرنی۔ سچی بات ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ میں تمھارے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہوں..... بہت سی باتیں۔ مجھے بولنے کا بہت شوق ہے۔'' وہ رکی، اب اندھیرا چھا چکا تھا اور مجھے اُس کے تاثرات اب اپنی مرضی کے مطابق اُس کے چہرے پر رکھنے تھے۔ ''میں تمھیں اپنے خواب سناؤں گی۔ میں نے ہمیشہ بہت خوب صورت خواب دیکھے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ رات کے دیکھے خواب دن کو اُلٹ ہو جاتے ہیں۔ شاید میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔'' اُس نے ایک لمبی سانس لی، ''اب میں نے دن کو خواب دیکھا کرنے ہیں۔'' اُس نے پھر ایک لمبی سانس لی۔

''دن کے دیکھے خواب کیا رات کو اُلٹ نہیں ہو جاتے؟'' میں نے کوئی بات کرنے کے لیے اُس سے پوچھا۔

''دن کے تو خواب ہوتے ہی نہیں۔ دن میں سب سچ ہوتا ہے، لوگ شادی بھی اِسی لیے دن کو کرتے ہیں۔'' اُس کی آواز میں مجھے ایک گونج سی محسوس ہو رہی تھی، جیسے وہ دور کھڑی دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اُن میں سے چیخ کر بات کر رہی ہو۔

''اگر کسی وجہ سے لوگ رات کو شادیاں کرنا شروع کر دیں؟'' میں نے اُس کے ذہن میں سے پریشانی نکالنے کے لیے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ جھوٹی شادیاں ہوں گی کیوں کہ دن کو تو سب کچھ سچ ہوتا ہے۔'' وہ رُکی، ''میں بھی رات کو شادی کرواؤں گی، اپنے والدین سے ضد کر کے۔'' اُس نے تھوک نگلا، ''تاکہ جاتے ہوئے تمھیں نظر تو نا آؤں۔''

مجھے لگا کہ وہ میرے ساتھ مخاطب نہیں، خود کلامی میں مصروف ہے۔ وہ اِس طرح باتیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہلکا کر رہی تھی۔ مجھے اُس پر ترس آیا اور اُسے چھونے کو دل کر آیا، اُس کا سر اپنی چھاتی کے ساتھ لگانے کو۔ اُس کی باتیں معصوم تھیں اور وہ اپنی ہی سوچوں میں گم بولے چلے جا رہی تھی۔ مجھے

محسوس ہوا کہ میں ایک دم بے حس ہو گیا تھا۔ میرے اندر ہر جذبہ شکستہ ہو گیا تھا، نوید کی گفتگو میں اب مجھے کوئی دل چسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ رٹے رٹائے فقرے بول رہی ہے۔ کیا وہ مجھے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہ رہی تھی؟ یا وہ اپنا خوف چھپانے کے لیے بولے چلے جانا چاہتی تھی؟ میں چاہتا تھا کہ وہ بولنا بند کر دے اور یہ بھی چاہتا تھا کہ وہیں کھڑی رہے۔ جو اُس نے بتایا تھا میں صحیح طور پر اُسے جذب نہیں کر سکا تھا۔ مجھے اُس کی موجودگی میں خاموشی کی ضرورت تھی۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ نظر نا آنے سے کیا وہ جائے گی نہیں؟ میں جانتا تھا کہ ہمارے ہاں شادی چاہے دن کو ہو یا رات کو، جس نے جانا ہوتا ہے وہ جائے گا۔ کیا میں اُسے جانے سے روک لوں گا؟ قطعاً نہیں! مجھے یک دم اپنے اندر ایک کمی کا احساس ہوا، جیسے نمک لگائے بغیر کھٹا سنگترہ کھا رہا ہوں۔ وہ اپنی منگنی ہو جانے کے باوجود گرمیوں کی راتوں کو مجھے ملنا چاہتی تھی۔ کیا وہ مجھے صرف اپنی باتیں سنانا چاہتی تھی؟ یا صرف اُس کی باتیں سننے کے لیے اُس سے ملوں؟ وہ زیادہ بولتی تھی اور میں کم؛ میں جانتا تھا کہ باتیں کرنا آسان اور سننا مشکل کام ہوتا ہے۔

''سپنڈو کے ساتھ تمھاری شادی کیوں کی جا رہی ہے؟'' میں اِس ملاقات کے مزاج میں نیا رنگ لانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پنجاب میں لڑکیوں کی شادیاں طے کرتے ہوئے اُن کی رائے نہیں لی جاتی۔ خواجہ محبوب اِس بے ڈھنگے آدمی کے ساتھ نوید جیسی خوش شکل لڑکی کی شادی کیوں کرنا چاہتا تھا؟ مجبوری دولت تھی یا کوئی رشتے داری؟

مجھے دوسری طرف سے فوراً جواب نہیں آیا، میں سمجھا کہ وہ چلی گئی ہے اور میں ہمیشہ کی طرح اُسے گھنی بیل کے اندھیرے میں نظروں سے ٹٹول رہا تھا کہ اُس نے مجھے چونکا دیا۔

''میں نے تو اُس کا کبھی نام ہی نہیں سنا ہوا تھا اور نا ہی دیکھا ہے۔ جو حلیہ میں نے سنا، تمھیں بتا دیا۔ ایک کام کریں!''

میں نے جواب نہیں دیا، جس طرف سے آواز آئی تھی اُدھر دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ ایسا کیا تھا جو ہم دونوں مل کے کر سکتے ہیں۔ مجھے اُس کی آواز میں ایک جھجک سی محسوس ہوئی؛ مجھے ایسے ہی گمان گزرا کہ وہ کوئی فرمائش کرنا چاہتی ہے۔ میرے ذہن میں اچانک شبر کی بات آ گئی اور میں کچھ گھبرایا ہوا آواز کی سمت میں دیکھتا رہا۔

''بھاگ چلیں!'' اُس نے قدرے دبی ہوئی سرگوشی میں کہا اور مجھے اُس کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ ''تم بے شک ساتھ کچھ نالانا، تم لوگوں کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں، میں نقدی اور زیور لے آؤں گی۔'' میں ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے نیچے گلی میں گر سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ایسا چاہے گی۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہی لڑکیاں آشناؤں کے ساتھ بھاگتی ہیں جن کے تعلقات گہرے اور ایک عرصے سے ہوں۔ ہم تو ابھی تک ایک دوسرے سے ملے بھی نہیں تھے؛ گلی کو کھائی بنا کر ملنا تو کوئی ملنا نہیں ہے!

''ٹھیک ہے!'' میں نے بغیر سوچے کہہ دیا۔ ''کب؟'' اب میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا اور اِسی گفتگو کے دوران میں ہی کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اِک پھسلن والی ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ وہ شاید مجھے آزما رہی ہو اور میرا کوئی عمل یا حرکت ایسی نہیں ہونی چاہیے جو اُسے مجھ سے دور کر دے۔ اپنے اندر کی کسی گہرائی میں وہ مجھے پسند بھی تھی۔

''تیار ہو؟'' اُس کی آواز میں مجھے حیرانی کے ساتھ ساتھ بے یقینی اور خوشی کا بھی احساس ہوا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم غصہ کر جاؤ گے۔ ایک لڑکی چاہے بھاگنا بھی چاہتی ہو اُس کا بھاگنے کی ترغیب دینا اچھی بات نہیں۔ یہ تو آدمی کا کام ہے۔'' پھر وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسی، اُس کی ہنسی میں تھکاوٹ کا بھاری پن تھا۔ ''میں تمھارے ساتھ بھاگوں گی یا تم مجھے بھگاؤ گے؟''

نوید ہر ملاقات میں ایک ایسی بات کر جاتی جس کی اُس سے توقع نہیں ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہی وہانوی کا ناول میرے منہ پر دے مارے گی جب کہ اُس نے دوسرا لینے سے بھی انکار نہیں کیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی اُسے تیسرا ناول دینا ہے۔

''تمھیں بھاگنے سے خوف نہیں آئے گا؟'' میں ختم کرنے کے بجائے بات کا رُخ بدلنا چاہتا تھا۔ آج میرے ساتھ ایسے ہوا کہ جیسے سالگرہ والے دِن اُس شخص کو قتل کر دیا جائے۔ کیا مجھے نوید سے محبت تھی یا اپنی تنہائی کو بہلانے کے لیے میں نے اُس کی محبت تعمیر کر لی تھی۔

''جب سے میری منگنی کی بات چلی ہے میرا ڈر جاتا رہا ہے۔ میں نے تمھیں سیٹی بجا کے کیوں نہیں بلایا؟ اِسی لیے۔ اب ڈر کس بات کا؟ تم تو اب بچے سے ہو'' وہ ہنسی۔ ''اِس لیے اب تمھیں اپنے گھر بلا لیا کروں گی۔''

مجھے اُس پر ترس آیا۔ وہ ایک طرح سے ٹوٹ رہی تھی اور اُس کو توڑنے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔

''گود میں بھی اُٹھایا کرو گی؟'' میں قدرے مطمئن تھا کہ بھاگنے والا مرحلہ ہم پار کر گئے تھے۔

''اُٹھا سکوں گی؟ تم تو جن کے جن ہو!'' وہ پھر ہنسی۔ میں نوید کے انتظار میں کئی کئی راتیں جاگتا رہتا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ اگر میری سوچ کا کوئی حصہ اُسے قبول کرنے سے خائف، جھجکتا یا انکاری تھا تو کوئی اور حصہ اُس کی محبت میں بُری طرح گرفتار تھا۔ میں اُس کے ساتھ اگر بھاگنا نہیں چاہتا تھا تو اُسے کھونا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن شاید میں اِس قابل نہیں تھا کہ اُسے اپنا بنا سکوں۔ میں ایک لاپروا، زندگی کے چیلنجوں کی طرف سے آنکھیں بند کیے، نہایت غیر ذمے دار آدمی تھا۔ ابا کسی طرح میرے تعلیمی اور دیگر اخراجات برداشت کیے جا رہے تھے لیکن میں اپنے شب و روز ایک کاہلی کے سپرد کر کے اُن کے ساتھ مسلسل دھوکہ کیے جا رہا تھا۔ مجھے خود سے شرمساری ہونے لگی۔ مجھے اپنی زندگی کو سنبھالنا ہوگا۔

''تو پھر میں تمھیں اُٹھا لیا کروں گا۔'' میں نے اپنے خیالات میں سے نکلتے ہوئے اُسے جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

''کیسے اُٹھاؤ گے؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ مجھے اب یہ ملاقات ایک ناٹک لگنے لگی تھی۔ میں اُس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید مجھے اُس کے ساتھ محبت تھی؟ محبت کیا تھی؟ ایک خلا یا اُس خلا کو بھرتا ہوا کوئی جذبہ؟ اگر مجھے اُس کے ساتھ محبت تھی تو میں اُسے بھگا کے لے جاؤں؟ میں اُسے کہاں لے کے جاؤں گا؟ میں گوجرانوالہ کو تو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا اور اِس کے علاوہ ہر بستی، قصبہ اور شہر میرے لیے اجنبی تھے۔ مرنے کا سوچنا آسان لیکن مرنا مشکل ہوتا ہے اِسی طرح بھاگنے کا سوچنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن بھاگنے کے لیے شاید ایسے حوصلے کی ضرورت ہو جو میرے پاس نہیں تھا۔

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا!

وہ شادی کر کے سینڈو کے ساتھ چلی جائے گی۔ میں یہاں اپنے کمرے میں اُس کے مائیکے آنے کا انتظار کیا کروں گا۔ یہ انتظار اُس انتظار سے مختلف ہوگا جو میں روزانہ اپنا بائیسکل صاف کرتے ہوئے نوید کے تانگے میں بیٹھ جانے کا کرتا ہوں۔ میں اُس کے مائیکے آنے کا انتظار کیا کروں گا اور سینڈو اپنی رال سُڑکتے ہوئے اُس کے بدن کی حدیں ناپ رہا ہوگا جب کہ اُس بدن پر پہلا حق میرا تھا۔ میں تو

اُس درزی کی طرح تھا جو کورے کپڑے کو کاٹ اور سی کر کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے۔ نوید نے لسی کا گلاس مجھے سب سے آخر میں دیا تھا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں مہمان نہیں اُس کا اپنا ہوں۔ مجھے چیاں والا بنگلے کے سارے سفر یاد آ گئے جب میں درختوں، پھولوں، جھاڑیوں، سبز گھاس، ٹہلتی ہوئی ہواؤں اور اِٹھلاتے ہوئے پانیوں کی خاموشی میں اُس کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ مجھے پھر ایک بار بنگلے میں جانا چاہیے، اب کے شاید اُسے بھلانے کے لیے۔ کیا میں اُسے بھلا پاؤں گا؟ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں مجھے بیوقوف نا بنا رہی ہو! وہ یقیناً ایک کھلنڈری روح تو تھی۔ اگر وہ مذاق کر رہی ہو تو جس اذیت میں سے میں گزرا ہوں کیا اُس کی قیمت ادا ہو سکے گی؟ اگر ایسا ہوا تو مجھے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھنی چاہیے اور نا ہی دیکھوں گا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کو سنبھالنا ہوگا اور کامیاب ہو کر ثابت کرنا ہوگا کہ مجھے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے کسے ثابت کرنا ہوگا؟ نوید کے جانے کے بعد مجھے اِس کمرے سے نکلنا ہوگا اور تبھی میں کامیاب ہو سکوں گا۔ کیا میں کسی بہانے نچلی منزل میں منتقل ہو جاؤں؟ اُس سے کیا ہوگا؟

مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں کافی دیر سے خاموش کھڑا ہوں اور شاید نوید میری خاموشی سے اُکتا کر نیچے چلی گئی ہو۔ میں بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی تھی اور میرے پاس صرف ایک ٹوٹا تھا جو میں نے صبح کی چائے کے بعد کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر وہ ٹوٹا سلگایا اور پیتے پیتے شاید سو گیا!

صبح جب میں نیچے گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں سب کی نظر بچاتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور چھوٹا بھائی میری چائے لے آیا۔ ابا ایک کوٹ کر کے چہرے پر دوبارہ جھاگ بنا رہے تھے اور میں اُن کے ہاتھ اور چہرے کی حرکت کو غیر حاضر دماغی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ رات جاگنے کی وجہ سے مجھے اپنی آنکھوں میں ایک چبھن کا احساس ہو رہا تھا اور میں نے اپنی نظر بھی نیچے رکھی ہوئی تھی کہ اماں جان نے فوراً پوچھ لینا تھا: رات کیا اُلو بن گئے تھے۔ ابا مجھے معمول کے مطابق دکھائی دیے جس طرح کہ میں نے اُنھیں اپنے تصور کی آنکھ میں خواجہ محبوب کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ اُنھیں اِس طرح دیکھ کر مجھے کسی حد تک تسلی بھی ہوئی اور مجھے عنبر ہم دونوں کے درمیان میں سے سرک کر دور کہیں دھند میں دھندلکی سی کھڑی نظر آئی۔

میرے آنے سے پہلے وہاں کوئی بات ہو رہی تھی جو یا تو ختم ہو گئی تھی اور یا اُسے ختم کر دیا گیا تھا۔ میں تھوڑا سا پریشان بھی ہوا کہ ایسے تو نہیں کہ میری ہی بات ہو رہی ہو؟ میری کیا بات ہو سکتی تھی؟ میں نے مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر پھیلنے سے روکا۔ یہ ایک بے ساختہ مسکراہٹ تھی جس نے اچانک میرے چہرے کا احاطہ کر لینا تھا اور کسی کے پوچھنے پر میرے پاس کوئی جواب نہیں ہونا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ لوگ کہیں عنبر یا نوید اور میرے متعلق بات تو نہیں کر رہے تھے؟ میں اِس خیال سے محظوظ ضرور ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اماں جان میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں نے اپنے چہرے پر لاتعلقی کا خول چڑھا لیا۔

''وصی میاں!'' اُنھوں نے بات شروع کی، ''تمھارے آنے سے پہلے ہم ساتھ والوں کی

بات کر رہے تھے۔'' وہ رکیں اور اُنھوں نے تائید کے لیے سب کی طرف دیکھا، ''خواجہ صاحب اپنی بیٹی کی منگنی کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ اُن کے ہاں ہونے والی رسم سے پہلے ہم اُنھیں اپنے گھر بلا لیں۔ ہمیشہ کی طرح تمھارے ابا کو یہ پسند نہیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟''

اب میں اپنے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ کو نا روک سکا۔ مجھے نوید کو جواباً کوئی مشروب پلانے کا موقع مل رہا تھا۔ میں نے فوراً رائے دینے سے پہلے تھوڑا جھجکنا مناسب سمجھا۔ ''اِن دونوں کی کیا رائے ہے؟'' میں نے چھوٹے بھائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں خوشی سے کھکھلا کے ہنس پڑے۔

''ابا نے ہماری رائے کو نابالغ سمجھا ہے۔'' منجھلے بھائی نے شرارت بھری آواز میں کہا۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی:

''کہتے تو ٹھیک ہیں لیکن رائے لینا ضروری ہے۔''

''تو آپ اماں جان کی بات سے متفق ہیں؟'' چھوٹے نے خوشی سے پوچھا۔ وہ دونوں گھر میں کسی نا کسی طرح مختلف قسم کا ہنگامہ چاہتے تھے۔ وہ شاید بوسیدہ قسم کے مشاعروں اور بدمزہ کھانوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اُن کے لیے خواجہ محبوب کے گھر دعوت پر جانا ایک نیا تجربہ تھا جس کا وہ کئی دنوں تک ذکر کرتے رہے تھے۔

''فیصلہ تو ابا اور اماں جان ہی کریں گے لیکن میں چاہوں گا کہ اُن لوگوں کو دعوت دی جائے۔'' اُن دونوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور اُنھیں خوش دیکھ کر اماں جان بھی خوش ہو رہی تھیں اور اُن کے عموماً ستے ہوئے چہرے پر سے ہر قسم کی دھول اُڑ گئی تھی۔ مجھے وہ کئی برس جوان لگیں۔ میں نے اُٹھ کر اُن کا ماتھا چوم لیا۔ ہمارے ہاں ایسے جذبات کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا کہ ہر کوئی اپنی ذاتی زندگی میں گم تھا۔ دونوں بھائی پہلے تو حیران ہوئے اور پھر اُنھوں نے بھی میری تقلید میں اماں جان کا ماتھا چوما۔ مجھے محسوس ہوا کہ ابا کو یہ اچھا نہیں لگا کہ ہم نے اُنھیں یکسر، اجتماعی طور پر، نظر انداز کر دیا تھا۔

وہاں ہم تینوں بھائی کچھ شرمندہ سے بیٹھے ہوئے تھے جب کہ اماں جان کے چہرے پر طمانیت میں ڈوبا ہوا غرور تھا۔ ابا ایک لاپرواسی لاتعلقی کے ساتھ تام چینی کے مگ میں سیفٹی ریز ر کو ڈبو ڈبو

کر چہرے پر پھیر رہے تھے۔ اُنھوں نے ڈاڑھی بنانے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرا، گود میں رکھے چھوٹے تولیے سے چہرہ صاف کیا اور پھر ہم تینوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ٹھیک ہے ! میری رائے اکثریت کے ساتھ ہی ہوگی پھر۔ ٹھیک ہے !'' اُنھوں نے مسکراتے ہوئے تائیدی اجازت دی۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے شرما رہے تھے؛ کیا وہ بھی نوید سے ملنا چاہتے تھے؟

فیصلہ ہوا کہ دو دن بعد خواجہ محبوب کے گھر والوں کو بلا لیا جائے۔ ناشتہ کر کے میں چیاں والا بنگلے کی طرف چل پڑا۔ ہمیشہ کی طرح میری رفتار کم تھی اور میں سوچوں میں گم مشین کی طرح پیڈل لگاتے ہوئے چلے جا رہا تھا۔ ایمن آباد سے میں نے سنگترے خریدے اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا کہ اِس بار اِنھیں کھاؤں گا۔ میں جب بنگلے میں پہنچا تو ہمیشہ کی طرح پسینے میں شرابور تھا اور ٹھنڈی ہوا ایک ناخوش گوار سی خوش گواری پیدا کر رہی تھی۔ میں نے لان میں مناسب جگہ پر بیٹھنے کے لیے نظر دوڑائی اور وہ بنچ منتخب کیا جہاں دھوپ اور سائے ملے ہوئے تھے اور وہاں بیٹھ کر مجھے ایسی حدت کا احساس ہوا جو نیند کا پیش خیمہ ہوتی ہے؛ میں نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ میں نے سنگترے کھانا شروع کر دیے۔ نوید کی منگنی کے اثرات کا انجذاب شروع ہو گیا تھا۔ میں ایک طرح کی ذہنی سراسیمگی کا شکار، اُسے موردِ الزام ٹھہرانے لگا تھا۔ پھر خیال آتا کہ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے سوار کے گرنے پر گھوڑے کی گردن اُڑا دی جائے۔ مجھے اُس پر ترس بھی آیا کہ اُس کی شادی ایسے آدمی کے ساتھ ہو رہی تھی جو اُسے پسند نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ بھاگنے کو تیار تھی؛ کیا میں اُسے بھگا لوں؟ میرے نوید کو بھگانے پر ابا کا کیا ردِعمل ہوگا؟ وہ پریشان ہوں گے اور اپنے تمام جاننے والوں سے میرے متعلق جاننے کی کوشش کرتے رہیں گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا جب کہ اماں جان کو یہ پریشانی ہوگی کہ مجھے اچھا کھانا اور آرام میسر آتا ہوگا؟ وہ میرے نوید کے ساتھ بھاگنے کو زندگی کا حصہ ہی سمجھیں گی۔ میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں؟ کیا عورت ایسے آدمی کی بستر میں صحبت برداشت کر سکتی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتی؟ اُس آدمی کی ناک سے بہتا پانی نوید کے گال گیلے کر دیا کرے گا۔ اُسے اُلجھن تو نہیں ہوا کرے گی؟

اُسی وقت بنگلے پر ایک تانگے میں ایک خاندان پہنچ گیا۔ اُن کے تین بچے تھے جنھوں نے تانگے میں سے اُترنے کے بعد حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ اردگرد دیکھا۔ وہ شاید پہلی مرتبہ یہاں آئے

تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ابھی اپنے گھر میں منتقل نہیں ہوئے تھے اور میں نے اِس گھر کے متعلق کافی سن رکھا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میرے چھوٹے بھائی ابھی دنیا میں نہیں آئے تھے۔ ہم ایک صبح گھر میں آئے تو مجھے اِس اجنبی سے شناسا گھر کو دیکھ کر عجیب طرح کا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جو اُس تصویر کی طرح تھی جسے کہیں رکھ کر میں بھول گیا تھا اور اب اچانک اُسے دیکھ کر بے یقینی کے ساتھ حیران ہو رہا تھا۔

اُن تینوں بچوں نے بنگلے کے متعلق اپنے والدین سے بہت کچھ سن رکھا ہوگا اور اُسے دیکھ کر اُسی اجنبی مگر شناسا سی بے یقینی کے ساتھ اپنے اردگرد کو دیکھ رہے تھے جس کے ساتھ میں اپنے گھر کو دیکھتا تھا۔ پھر اُنھیں اپنا اردگرد دیکھا دیکھا اور کسی حد تک شناسا سا محسوس ہونے لگا اور وہ شور کرتے ہوئے چاروں طرف بھاگنے لگے۔ بنگلے کی خاموشی اور پرسکون وقار کے پس منظر میں اُن کا شور جہاں ماحول پر ایک بوجھ سا تھا وہاں اُسی شور کی معصومیت میں ہر چیز کھل اُٹھی تھی۔ وہ بہار کے مست دن تھے اور بچوں کی ماں اُس شور سے بے نیاز اپنے خاوند کو اُس چڑیا کی طرح دیکھتی تھی جو روشن دان میں چڑے کی منتظر بیٹھی ہو۔ میں نے ایسا نظارہ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خاوند نے تانگے میں سے سامان نکالا اور وسیع لان کے درمیان میں پہنچ کر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی اور مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھ کر ناپسندیدگی کے ساتھ اُکتایا ہوا منہ بنایا۔ بچے اُن کے گرد شور کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ وہ ہماری چھت کے پڑوسی کبوتر باز کے کبوتروں کی طرح دڑبے سے نکلنے کے بعد چھوٹی چھوٹی پرواز لے رہے تھے۔

وہ خاندان میری یکسوئی میں خلل انداز ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر نہر کے کنارے جا بیٹھا۔ بچے کچھ دیر گھبراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے رہے، اُن کے خیال میں مَیں بنگلے کے سکوت کا حصہ تھا اور میرے اُٹھ جانے سے اُس تصویر کے زاویے تبدیل ہو گئے تھے۔ پھر وہ اپنی بھاگ دوڑ میں مجھے بھول گئے اور میں نہر کے کنارے پر نوید کے خیالوں میں گم ہو گیا۔ میرے لیے اُسے پانا اہم تھا یا کھونا؟ میں شاید خود اذیتی میں لذت حاصل کر رہا تھا اور میرے زیادہ وقت اکیلے گزارنے کی یہی وجہ تھی۔ اپر چناب کے کنارے بیٹھے ہوئے، پانی کی مست خرامی میں گم، مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نوید سے محبت کرتا ہوں۔ اِس انکشاف سے میں کچھ خوف زدہ ہوا اور میرے جسم میں خوشی کی ایک لہر بھی دوڑ گئی۔

میں نے ایک اور سنگترہ کھایا!

میں نے خود کو نہر کے پانی ساتھ بہتے ہوئے محسوس کیا۔ نہر کے پانی کے بہاؤ میں ایک اعتدال تھا جس کا مجھے اپنے اندر فقدان محسوس ہوا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ بے یقینی میں گرفتار پاتا جب کہ نہر کے پانی میں غرور میں ڈوبا ہوا اعتماد تھا۔ میں پانی کی مخالف سمت میں بہتا تھا، ہوا کے اُس جھونکے کی طرح جو پانی کی اوپری سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں بناتا ہو۔ کیا میری محبت زندگی کی روانی میں لہریں پیدا کر سکے گی؟ مجھے اچانک اقبال غوری کا خیال آیا۔ اُس کے عنبر کے ساتھ رشتے کے شک کے بعد میں اُس سے نہیں ملا تھا۔ کیا عنبر کے ساتھ میرے تعلق میں جسم کے ساتھ میری سوچ کو بھی دخل تھا؟ مجھے یہ خیال نوید کے ساتھ بے وفائی لگا اور شرمندگی کا احساس بھی ہوا۔ میں اقبال غوری کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کر کے پانی کو بہتے ہوئے دیکھنے لگا۔

ایک آدھ دن کے بعد خواجہ محبوب کے گھر والے ابا کی دعوت پر ہمارے ہاں دوپہر کو کھانا کھائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ابا اُن کے ساتھ کیا فیصلہ کریں لیکن میں چاہوں گا کہ وہ دوپہر کو ہی آئیں؛ رات کے اندھیرے میں شاید نوید کو اچھی طرح دیکھ نا سکوں۔ مجھے اُس کھانے سے، اِس کے علاوہ ،کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نوید کو نزدیک سے دیر تک دیکھنا چاہتا تھا۔ اماں جان اور میرے چھوٹے بھائی کام کریں گے جب کہ میں ابا کے ساتھ مہمانوں کے پاس بیٹھوں گا۔

گرمیوں میں نوید کے گھر والوں نے چھت پر سویا کرنا ہے اور اُس نے مجھے اپنے گھر بلانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اُسے ملنے کا اتنا ہی متمنی تھا جتنا کہ وہ تھی! ہماری ملاقاتوں کی نوعیت کیا ہوگی؟ بیٹھ کر باتیں کریں گے جیسے کہ وہ باتیں ہی کیے جانا چاہتی تھی یا اِس کے علاوہ ہمارے جسم بھی حرکت میں آئیں گے؟! اگر جسم حرکت میں نا آئیں تو وہ کیا سوچے گی؟ کہ ایک ایسے آدمی کے ساتھ واسطہ پڑا تھا جو عورت کے جذبات ہی نا سمجھ سکا؟ وہ اپنی جاننے والیوں سے کہے گی کہ اُس کے آشنا نے زندگی کی ایک دل چسپ رات ضائع کر دی۔ اگر میں اُس کے جسم تک رسائی حاصل کر جاؤں تو کیا یہ غیر اخلاقی عمل تو نہیں ہوگا ؟ میں نے عمر میں اپنے سے بڑے لوگوں کی گفتگو میں ایسے ہی متزاد باتیں سنی تھیں۔ کچھ کا کہنا تھا کہ عورت کے ملنے کی وجہ ہی یہی ہے اور کچھ کا کہنا تھا کہ آدمی بہت سی باتیں اپنے مقصد کے لیے فرض کر کے اُن پر عمل کر جاتا ہے۔ میں بھی اُن کی مانند ایک طرح سے ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ میں نوید کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھ جسمانی رشتہ استوار کرنے سے خائف تھا۔ کیا میں بزدل تھا یا مجھے اپنی مردانگی پر شک

تھا؟ اگر میں بزدل ہوتا تو اُس کے ساتھ ملنا کیوں چاہتا اور اگر اپنی مردانگی میں مجھے کسی کمی کا شک تھا تو عنبر ایک عرصہ تک میرے ساتھ منسلک کیوں رہتی؟

میں کسی حد تک مطمئن بنگلے سے نکل پڑا!

میرا بنگلے پر جانے کا مقصد کیا تھا؟ کیا میں اُس آدمی کی طرح تھا جو خود ساختہ اُلجھنوں کا حل شراب میں ڈھونڈتا ہے؟ میرے لیے بنگلہ بھی شاید شراب خانہ ہی تھا۔ مجھے وہاں بیٹھ کر سکون ملتا اور میں اُس شرابی کی طرح ہوائی قلعے تعمیر کرتا جاتا۔ لان کے درمیان میں دستر خوان بچھا ہوا تھا جس پر پورا خاندان جھکے ہوئے کھانے کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ ہمارے ہاں پکنک کا مطلب کھانے کی جگہ کی تبدیلی تھا تا کہ نئی جگہ پر جا کے مزید کھایا جا سکے۔ مجھے وہ لوگ اُن گِدھوں کی طرح لگے جو پروں کی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے مردار کی بوٹیاں کھینچ رہے ہوں۔ وہ اپنے کام میں اتنے مصروف تھے کہ اُنھوں نے میری طرف دیکھا ہی نہیں یا میں اُنھیں نظر نہیں آیا۔ اُن کا تانگہ بنگلے کے باہر کھڑا تھا۔ گھوڑا ایک درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا، اُس کے سامنے بوری پر تھوڑا سا سبز چارا پڑا ہوا تھا اور پچھلے سموں سے تھوڑا ہٹ کر لید بکھری سی ہوئی تھی اور وہیں زمین میں جذب ہو چکے پیشاب کا نشان تھا۔ بنگلے کے باہر چھوٹی عمر کے چند لڑکے دو ائیر گن اُٹھائے شکار ڈھونڈ رہے تھے۔ اُنھیں بنگلے کے اندر شاید شکار کرنے کی اجازت نہیں تھی ورنہ وہاں درختوں پر چڑیوں کے غول جگہیں بدلتے ہوئے آ جا رہے تھے۔

میں اپنی رفتار سے واپس چل پڑا۔ جب گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی اور سب لوگ صحن میں ایسے بیٹھے تھے جیسے اُنھیں میرا انتظار ہو۔ مجھے کچھ اُلجھن بھی ہوئی کہ کیا مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا؟ ساتھ ہی ایک جھجک نے مجھے کچھ پریشانی لاحق کر دی کہ کوئی ایسا معاملہ ہی نا ہو جو مجھ سے تعلق رکھتا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی میں بائیسکل کو کھڑا کیا اور اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ابا خواجہ محبوب کے گھر دعوت دینے گئے تھے جو اُنھوں نے قبول کر لی۔ ہمارے گھر کی پارلیمنٹ اب کھانے کے متعلق بحث میں تھی۔ اماں بہاری کھانے بنانا چاہتی تھیں جب کہ چھوٹے بھائی خواجہ محبوب جیسے پنجابی کھانے کی ضد میں تھے۔ مجھے فیصلے سے پہلے ہونے والی گھر کے افراد کی بحث ہمیشہ ہی اچھی لگتی آئی تھی اور اُس شام میں رائے دیے بغیر پوری توجہ سے اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔ میں ہر ایک کی بات سنتے ہوئے خاموشی کو ترجیح دے رہا تھا۔ آخر کار مجھے اُس بحث میں شامل کر لیا گیا۔ میرے آنے سے بحث کو ایک نئی

سمت مل گئی۔ میری رائے تھی کہ دعوت میں دونوں قسم کے کھانے شامل کر لیے جائیں اور لسی کے بجائے لیموں پانی یا کسی قسم کا شربت ہو؛ سبزیاں بہاری طریقے سے پکائی جائیں؛ مقامی ذائقے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ اماں جان بازار سے کچھ بھی لانے کے حق میں نہیں تھیں۔ وہ روٹیاں بھی خود ہی بنانا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے ہمیں مختلف کام بتائے جو ہم نے کل کرنے تھے اور ابا کو صبح جلدی نکل کر سودا لانے کا کہہ کر وہ اُٹھ کر چلی گئیں اور میرے لیے بھی کھسک جانے کا یہ موقع تھا!
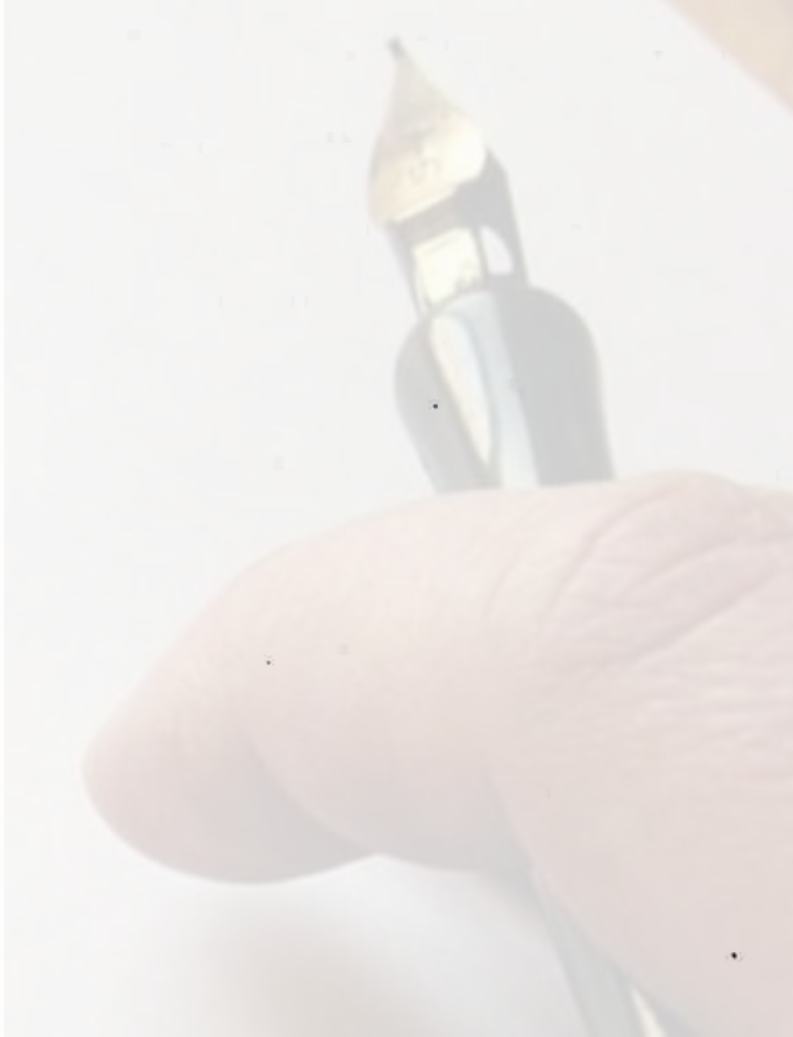
میں جب اوپر گیا تو شہر مجھے دن بھر جاگنے کے بعد انگڑائی لیتے ہوئے محسوس ہوا۔ شہر جلد جاگنے اور جلد سونے کا عادی تھا۔ لاہور اور ملتان کے برعکس اِس شہر نے بہت کم ہنگامے یا تاریخی اتل پتھل دیکھی تھی۔ اِس کی وجہ اِس کا لاہور کے نزدیک ہونا یا لاہور سے پہلے ہونا تھا۔ جغرافیائی طور پر یہ لاہور سے اتنا دور نہیں تھا کہ حملہ آوروں کو یہاں پڑاؤ کرنا پڑتا۔ فوجیں جہاں جہاں پڑاؤ کرتی رہیں وہاں کی مقامی آبادی میں اُن کا خون بھی شامل ہوتا رہا۔ اور یہ لاہور سے اتنا نزدیک بھی نہیں تھا کہ اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ چناں چہ گوجرانوالہ ایسا شہر رہا جس نے لاہور کا اثر قبول نہیں کیا لیکن حملہ آور یہاں سے گزرتے ہوئے لاہور جاتے تھے اِس لیے وہ ہمیشہ یہاں سے کوئی ثقافتی، سماجی یا عسکری ایجاد اپنے ساتھ ضرور ساتھ لے جاتے جو سلسلہ تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ یہاں سے ادب، کھیل اور فن کے میدان سے ایسے لوگ وہاں گئے جنھوں نے لاہور کو شہرت بخشی۔

شہر مجھے انگڑائی لیتے ہوئے محسوس ہوا!

میں بعض اوقات راتوں کو شہر میں گھومتا رہا ہوں۔ مکان ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح ملے ہوئے تھے، لگتا تھا کہ عورتیں سر جوڑے کسی مسئلے پر غور کر رہی ہیں۔ گلیاں تنگ اور اندھیری تھیں اور اتنی ناہموار کہ اجنبی ہر قدم پر ٹھوکر کھاتا جائے۔ اِن گلیوں میں رات کے اندھیرے میں وہی لوگ چلتے تھے جنھوں نے ہی وہاں چلنا تھا۔ میں بھی اُن لوگوں میں شامل تھا۔ شہر کی دو زبانیں تھیں۔ ایک زبان جو وہ دن کو بولتا تھا۔ اِس زبان کی فرہنگ آسان، گفتگو کا لہجہ بلند اور کرخت تھا، ہر بات کے دو معنی ہوتے تھے؛ ایک وہ جو سننے والا فوراً سمجھ جاتا تھا اور دوسرا وہ جس میں ایسا مزاح ہوتا جسے وہ کچھ دیر بعد سمجھتا اور دیر

تک لطف اندوز ہوتا یا غصے میں کھولتے ہوئے حساب برابر کرنے کا سوچتا۔ راتوں کو اُن کے لہجے میں نیند میں ڈوبی سرگوشی ہوتی اور وہ ہمیشہ جلدی میں نظر آتے، اُنھیں گھروں میں پہنچنے یا وہاں سے نکلنے کی بیتابی ہوتی۔ دن کو کام نمٹا کر عورتیں دہلیزوں پر بیٹھی گلی کو خالی نظروں سے دیکھتی رہتیں۔ اُنھیں اپنی زندگی کو کارآمد بنانے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ اُس گھر میں بھیجی گئی تھیں؛ وہ جانتی تھیں کہ اُنھوں نے کسی نا گھر میں تو جانا تھا۔ وہ تو اپنے آدمیوں کے بیج کو زرخیز زمین فراہم کرنے کے لیے آئی تھیں۔ آدمی جب گھر سے نکلتے تو اُن کے ذہن میں صرف اپنے کام ہوتے اور وہ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک جوش میں ہوتے۔ دِن گزرنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں گھر یاد آنے لگتے اور وہ اپنی بیویوں کے ساتھ رات کو بستر میں گھسنے کے منصوبے بنانا شروع کر دیتے؛ اُن کی اپنے کام میں دل چسپی کم ہوتی جاتی۔ وہ رات کو جب گھر آتے تو بھی وہ جوش میں ہوتے۔ اُنھیں اپنی تھکاوٹ، کاروباری اُلجھاؤ یا دباؤ اور ناکامی کو اپنی بیوی کے اندر اُنڈیلنے سے کامیابی حاصل ہوتی اور بیوی اُکتاہٹ، بے زاری اور تھکاوٹ کو ظاہر کیے بغیر اپنے آدمی کو اپنا آپ ہلکا کرنے دیتی، کسی قسم کی پیچیدگی میں اُلجھے بغیر!

شہر آدھی رات کے بعد ایک اور کروٹ لیتا۔ عورتیں اپنے بستروں سے اُٹھ کر آسمانوں کی طرف دیکھتیں اور پھر بے سدھ سوئے خاوندوں اور اُن کی وجہ سے وجود پانے والے بچوں پر نظر پڑتے ہی اُن کے وجود ایک نرم سی محبت کی حدت میں پگھلنے لگتے، اُنھیں پوری کائنات اپنی نگران محسوس ہوتی اور وہی خاوند جن سے اُنھیں ایک طرح کی لاتعلقی تھی، اچانک اپنے لگتے؛ وہ مطمئن سی گہری نیند سو جاتیں۔

یہ ایک مذہبی شہر تھا جہاں ہر فرقے کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برداشت اور بھائی چارے کے ساتھ زندگی کرتے تھے لیکن اُنھیں اپنے نظریے سے اختلاف پسند نہیں تھا۔ اُنھیں شیعوں کے ماتمی جلوس نکالنا پسند نہیں تھا لیکن وہ جلوس کے راستوں میں سبیلوں اور فوری طبی امداد کا بندوبست ضرور کرتے۔ یہ شہر اختلاف میں ڈوبا ہونے کے باوجود محبت کا ایک گہوارہ تھا۔ مجھے لوگوں کے لاتعلقی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہونا پسند ہونے کے باوجود شدید اختلاف پر حیرت ہوتی۔

میں اوپر کھڑا آسمان کو دیکھتا تھا۔ تارے نظر آنا شروع ہو گئے تھے، اردگرد گھروں کی چھتوں پر بتیاں ابھی روشن نہیں ہوئی تھیں۔ میں مکمل اندھیرے میں تھا اور بیل کسی آسیب کا سایہ لگ رہی

تھی۔ میں آسمان پر تاروں کو دیکھ رہا تھا کہ اردگرد اکا دُکا بتی روشن ہونا شروع ہوگئی۔ یہ ایک عجیب وقت ہوتا ہے؛ نا اندھیرا اور نا اُجالا! ساتھ والے گھروں کی روشنیوں کا عکس ہماری چھت پر پھیلنا شروع ہوگیا تھا اور میں نوید کے گھر کی چھت پر بیل کے گہرے سائے کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُسی وقت ایک سایہ جھجکتے ہوئے آگے کو بڑھتا ہوا نظر آیا۔ میں کچھ پریشان اور خوف زدہ سا تھا اور خوش بھی کہ نوید آ گئی ہے۔

میں سیٹی کے انتظار میں تھا!

وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے پیچھے روشنی تھی اور مجھے اُس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جواب دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''آج تمھارے ابا آئے تھے۔'' اُس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں خاموش اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے اُس کی آواز میں بنگلے میں کھلے ہوئے پھولوں سی تازگی کا احساس ہوا۔ ''ہم پرسوں تمھارے گھر آئیں گے۔ میں تو بہت بے چین ہوں؛ وقت ہی نہیں گزر رہا۔''

''میں بھی!'' میں نے سچ بات کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

''تم کیوں؟'' اب وہ سنجیدہ تھی۔ مجھے اُس کے سبھاؤ کی یہ تبدیلی اچھی لگی۔ میں اب اُسے اچھی طرح دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔

''تاکہ تمھیں شربت وغیرہ پلاؤں اور......'' وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ وہ اُس بچے کی طرح یک دم ہنس پڑا کرتی تھی جسے گدگدی کر دی گئی ہو۔ ''اور تمھیں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے نزدیک سے دیکھوں۔ زیادہ سج کر نا آنا۔'' اُس نے قہقہہ نہیں لگایا۔

''کیوں جی! سجوں کیوں نا؟'' اُس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''تمھیں سجنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''اچھا جی!'' اُس کی آواز میں شوخی تھی۔

''ہاں جی!''

''ٹھیک جی!'' وہ پھر ہنسی، ''لیکن میں پھر بھی سج کے آوں گی۔ تمھارے گھر پہلی مرتبہ آنا ہو اور میں سجوں بھی نا؟ ممکن نہیں وصی جان!'' اُس نے جان کہا اور مجھے اپنی ٹانگیں ایک دم کانپتے ہوئے محسوس

ہوئیں۔ مجھے سمجھ نہیں آئی یہ خوشی کی وجہ سے تھا یا اُس اچانک پن کا سبب جو اُس لمحے میرے حواس پر چھا گیا تھا۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ جب کسی رات کو وہ مجھے اکیلی ملے گی تو کیا میری ٹانگیں ایسے ہی کانپنے لگیں گی؟

''سچ آنا۔'' مجھے اپنی آواز گلے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔

''میں چاہوں گی تم بھی اچھے کپڑے پہنو۔ بال سنوارے ہوں۔ روز کی طرح نہیں ہونا۔''

''روز کیسے ہوتا ہوں؟'' میں متجسس ہو گیا۔

''ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور اُلجھے ہوئے بال۔'' اُس نے میرا حلیہ بیان کر کے مجھے کچھ شرمندہ سا کر دیا۔ ''تمھارے بال تو بہت پیارے ہیں، اِنھیں ترتیب سے رکھا کرو۔ جس بھی رات تم میرے گھر آئے، میں انگلیوں سے انھیں سنوار دیا کروں گی۔'' ایک مختصر سے وقت میں، مَیں نے رات کو ملنے کے بارے میں سوچا اور اُسی وقت نوید نے بھی وہی بات کی۔ کیا ہم واقعی ملیں گے؟

''یہ مردانہ فیشن ہے۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ہوگا مردانہ فیشن! مجھے ترتیب والے بال پسند ہیں۔''

''جس رات ملے تو بنا دینا۔'' میں ملاقات کا یقین کر رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑی تھی اور اردگرد جلتے بلبوں کی روشنی میں نا اندھیرے میں تھی اور نا روشنی میں۔ وہ میرے سامنے حقیقت میں دیکھے جانے والے خواب کی طرح کھڑی تھی یا خواب میں نظر آنے والی حقیقت کی طرح۔ میں اُس کے ہونٹوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا، میں اُس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا، میں اُس کے پیٹ کی گہرائی ناپنا چاہتا تھا لیکن میں گلی کے اِس پار کھڑا تھا۔

ہمارے لفظ ساتھ چھوڑ گئے تھے یا ہم نے خاموشی کو زبان بنالیا تھا۔

میں اقبال غوری سے ملا۔ کچھ دیر عنبر ہمارے درمیان میں موجود رہی اور پھر غیر اہم چیز کی طرح آہستہ آہستہ ہمارے درمیان میں سے خارج ہو گئی۔ سکول ختم ہونے کے بعد ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ وہ ہمیشہ لڑکیوں کے ساتھ اپنے کارناموں کو ایک مبالغے کے ساتھ بتایا کرتا تھا اور اُس دن بھی ایسے کر رہا تھا۔ اُس نے کئی ایسے واقعات سنائے جن میں لڑکیاں اُس پر مرمٹی تھیں، وہ ارادتاً یا اتفاقاً عنبر کا نام بیچ میں نہیں لا رہا تھا۔ میں نے اُسے نوید کے متعلق سرسری سا بتایا اور یہ بھی کہ وہ مجھے اپنے گھر بلا رہی ہے۔ اقبال غوری کے رویے میں ایک دم تبدیلی آ گئی۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ اُس کے دیکھنے میں ایک تمسخر تھا۔ مجھے لگا کہ اُسے میرا نوید کے ساتھ تعلق پسند نہیں آیا اور اُسے اچانک اپنے رومانوں میں ایک کمی کا احساس ہوا ہے۔

''خان صاحب! جہاں تک ممکن ہو عورتوں کے ساتھ سونے کے لیے اُن کے گھروں میں نہیں جاتے، محفوظ نہیں ہوتا۔'' مجھے اقبال غوری کی منطق میں وزن محسوس ہوا۔ مجھے اپنا جسم لرزتے ہوئے لگا۔ میں جب بھی عنبر سے ملنے جاتا تھا تو ہمیشہ مجھے کوئی چیز روکتے ہوئے لگتی جسے بمشکل نظر انداز کر پاتا۔ اُس رکاوٹ کی وجہ مجھے آج سمجھ آئی۔ وہ ایک اَن دیکھا خوف تھا کہ اگر کوئی آ گیا تو کیا ہوگا؟ کیا یہ خوف اپنے گھر میں نہیں ہوگا؟

''تو پھر؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اقبال غوری نے ایک دم نوید اور میرے درمیان میں خوف کی دیوار کھڑی کر دی تھی؛ شاید نوید اِس دیوار سے بے خبر ہو۔ نوید کے ساتھ ملاقات کی اُمید مجھے ایک دم ناممکن سی بات لگی۔

''پھر یہ کہ آپ اُسے اپنے گھر بلائیں۔'' اقبال غوری کی نظر میرے چہرے پر تھی۔ مجھے اُس کی طرف دیکھنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دماغ، جتنی رفتار ممکن ہو سکتی تھی، اُتنی ہی تیزی کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ کیا ہماری ملاقات کا کوئی طریقہ نکل سکتا ہے؟

''اگر وہ نا آئے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے، اپنے اندر کسی اُمید کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''اگر میرا تجربہ ساتھ دے رہا ہے تو وہ آئے گی۔'' اقبال غوری نے وثوق سے کہا۔ مجھے اقبال غوری میں ہمیشہ ایک خود پسندی کا احساس ہوتا تھا لیکن پہلی مرتبہ آج مجھے اُس میں خلوص اور صداقت نظر آئی۔

''میں اُسے آنے کے لیے قائل کیسے کروں؟'' میں اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔

اقبال غوری نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ ''جب وہ آئے تو ہدایات کے لیے بھی مجھے بلا لینا۔'' میں نے چونک کر اقبال غوری کی طرف دیکھا۔ میری نظر میں غصہ تھا۔ وہ کسی حد تک جھینپ گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ایسے معاملات وہیں، موقع پر ہی طے ہوتے ہیں۔ اُن کی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کی جا سکتی۔'' وہ ایک تلخ فقرے کو اپنی منطق کی مٹھاس میں چھپا گیا۔

ہم وہاں سے اُٹھ گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ ہمارے گھر میں ایک ہنگامے نے رونق پیدا کر رکھی تھی۔ امی چولھے کے پاس بیٹھی دو دیگچیوں کو سنبھالے ہوئے تھی اور میرے بھائی افراتفری، سراسیمگی اور اپنے آپ کو اہم سمجھتے ہوئے صحن اور باورچی میں چکر لگائے جا رہے تھے۔ ابا صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے شاید پہلی مرتبہ سب کے چہروں پر خوشی نظر آئی۔ گھر میں مشاعروں کے لیے بھی کھانے تیار کیے جاتے تھے لیکن اُن میں ایک طرح کی بے دلی ہوتی تھی اُس طالبِ علم کی سی جو امتحان میں نا بیٹھنے کی خواہش کے باوجود والدین کے دباؤ کی وجہ سے تیاری کر رہا ہو۔ اُس شام گھر میں مجھے اُس طالبِ علم سا جوش لگا جو امتحان دینے کی خواہش کے ساتھ تندہی سے تیاری میں جُتا ہو۔

میں اِک ہنگامے پر مبنی گھر کی رونق سے لطف اندوز ہو رہا تھا!

اُسی وقت اماں جان نے ماسی کو آواز دی کہ وہ کچھ دیر چولھوں کو سنبھالے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ ماسی بھی اُس ہنگامے کا حصہ تھی۔ اماں جان نے اپنا ڈوپٹہ سیدھا کیا اور نل چلا کے منہ پر چھینٹے مارنے کے

بعد باورچی خانے میں چلی گئیں۔اب شام ڈھلنا شروع ہوگئی تھی اور باورچی خانے کے باہر کا بلب جلا دیا گیا تھا۔اُسی وقت بلب کی روشنی لڑکھڑا کر پوری ہوئی تو ابا نے بلب کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بولے نہیں، عام حالات میں اُنھوں نے ہیٹر چلانے پر ہنگامہ برپا کر دینا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد اماں جان چائے اور پانی کے گلاس ٹرے میں لیے ہوئے آگئیں۔اُنھوں نے چائے ہیٹر پر بنائی تھی۔

''سب ہوگیا؟''میں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا حصہ بننے کی غرض سے پوچھا۔اماں جان کے مزاج میں آلودگی نہیں تھی ورنہ وہ کوئی ایسی بات کہہ دیا کرتی ہیں جس میں تلخی نمایاں ہو۔ وہ اطمینان سے مسکرائے جارہی تھیں۔

''ہاں ! تقریباً !صرف بند گوبھی کے پکوڑے رہ گئے ہیں جو کل بناؤں گی ۔''اُنھوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔''وہ کھانے کے ساتھ کڑاہی سے نکلنے کے بعد ہی بھیجتی رہوں گی۔''

''کرارے ہونے چاہئیں۔''میں نے مشورہ دیا۔

''سبز مرچ ڈالوں گی۔''میں نے گلے کو ایسے حرکت دی کہ لگے منہ میں آئے پانی کو حلق میں سے اُتارا ہے۔اماں جان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔''اتنے کرارے بھی نہیں کہ خواجے کھا ہی نا سکیں۔''

''اُنھوں نے نا کھایا تو ہم کھالیں گے۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔اگر کرارے ہوئے تو نوید نے ہی کھا جانے ہیں۔ میں اُس کی ناک اور آنکھوں میں سے پانی بہتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔چائے ختم کر کے اماں جان اُٹھ گئیں!

پہلے میں نے اپنے کمرے میں جانے کا سوچا لیکن پھر خیال آیا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں ابا کے پاس بیٹھا ہوں۔ میں نے اُن کے پاس بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔میرے خیال میں ہمارے بیچ اب رقابت نہیں رہی تھی۔ابا ایک دراز قد،خوب رو آدمی ہیں اور عمر نے اُن کے چہرے پر جاذبیت کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جن کا میں متمنی ہوں؛اِس کے لیے شاید مجھے اُن کی عمر تک پہنچنے کا انتظار کرنا ہوگا۔اُن کی اِسی وجاہت نے عنبر کو اُن کی طرف مائل کر دیا۔اُن محفلوں میں جتنے بھی لوگ آتے تھے،ابا کی شخصیت اُن سب پر حاوی تھی۔ابا نے ایک غلط فیصلہ کیا جو اُنھوں نے مجھے پیغام رساں بنایا اور اگر ابا خود چلے جاتے تو شاید عنبر آج بھی اُن کی داشتہ یا محبوبہ ہوتی۔وہ شاید کسی مصلحت کے تحت بتدریج اُس کے قریب آنا چاہتے

تھے۔

میری نظر اُن کی طرف اُٹھ گئی؛ وہ صحن کے ہنگامے کو دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک عرصے سے گھر کے معاملات سے کٹے رہے تھے۔ مدت تک گھر کی الاٹمنٹ اُن کی سوچ پر حاوی رہی اور پھر عنبر کے آسیب نے اُنھیں اپنے قبضے میں کیے رکھا۔ مجھے وہ اِس طرح آرام سے بیٹھے ہوئے اچھے لگے۔ میں نے اُن کے پاس ہی بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔

صحن میں بلب کی روشنی مکمل طور پر قابض ہو چکی تھی۔ چولھے کے پاس بیٹھیں اماں جان کے چہرے پر آگ اور بلب کی روشنی کی وجہ سے چمک اور سرخی کھنڈی ہوئی تھی۔ میں نے اُن کے چہرے پر اتنا اطمینان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔

''اماں جان! آپ اتنا خوش کیوں ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اُنھوں نے ہماری طرف دیکھا اور پھر چولھے سے اُٹھ کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اب اُن کے چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔

''مجھ سے خوشی چھپائے نہیں بن رہی۔'' اماں جان بھی اُن بیہودہ قسم کے مشاعروں میں کبھی کبھار ویسی ہی غزل پڑھا کرتی تھیں۔ ''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج ہم اِس ملک کا حصہ بنے ہیں جب ہم نے اپنے قریبی لوگوں کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی قبول کیا ہے۔'' یہ ایک مختصر سی، پُر تاثیر تقریر تھی۔ میں اماں جان کی بات کا جواب دینے کے اہل نہیں تھا اور میں نے مدد کے لیے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش نظروں سے اماں جان کا چہرہ دیکھے جا رہے تھے۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ اُن کی نظر اماں جان کے لیے تعریف لیے ہوئے تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا یا میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اماں جان کو اُنھوں نے ایسی نظر سے دیکھا ہو۔ مجھے یہ عجیب سا لگا؛ خوشی ہوئی اور حیرت بھی کہ اُنھوں نے پہلے ایسے کیوں نہیں دیکھا تھا؟ ''چند دنوں میں اُن کی بیٹی کی منگنی ہونے والی ہے۔ وہ اگر نا بھی بلائیں تو میں جاؤں گی اور میں نے،'' اُنھوں نے ابا کی طرف غور سے دیکھا، ''ایک جوڑا بھی لے کر جانا ہے۔'' مجھے لگا کہ میرا دل ایک دھڑکن دھڑکنا بھول گیا ہے۔ مجھے اپنا سانس اٹکتے ہوئے محسوس ہوا اور چھاتی میں ایک خلا وجود پاتے لگا۔ میں نے اپنی کیفیت کو بحال کرنے کے لیے ارد گرد دیکھ کر کوئی سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مجھے نوید کی منگنی کا ذکر پسند نہیں آیا تھا۔ میں اُس کی منگنی کو روک نہیں سکتا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم اِسی طرح گلی کو

بیچ میں رکھ کر باتیں کرتے ہوئے زندگی گزار دیں اور اگر کبھی کسی رات مل سکیں تو جسموں کا ملاپ بھی کرا دیں۔ یا میری محبت اُن بے شمار بے گھر محبتوں کی طرح میرے سینے میں دفن ہو کر رہ جائے گی اور میں کسی اور کے ساتھ بے کیف زندگی گزار دوں گا۔ میں نے ابا کی طرف دیکھا؛ وہ اماں جان کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے اُٹھ کر اوپر جانا مناسب نہیں لگا اور وہاں بیٹھے ہوئے مجھے اپنا دم گھٹتے ہوئے لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قائم رکھنے کی لیے ایک لمبی سانس لی۔ نوید شادی کے بعد چلی جائے گی۔ وہ کوئی چند دنوں کے لیے سامنے والے گھر میں آنے والی ہستی نہیں تھی جو آئی ہی جانے کے لیے تھی! وہ ہماری مشترک گلی کی مستقل رہائشی تھی اور اُس کے جانے نے ایک مستقل خلا چھوڑ جانا تھا؛ اُس کے چھوڑے ہوئے خلا نے میرے اندر منتقل ہو جانا تھا۔ محبت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منتقل نہیں ہوتی۔ اگر یہ منتقل ہو سکتی تو کیا نوید میری محبت کو اپنے منگیتر کے لیے پس انداز کر لیتی؟

مجھے یقین ہو گیا کہ میں نوید سے محبت کرتا ہوں! میں نے آہ سے ملتی جلتی ایک لمبی سانس لی۔ اماں جان نے میری طرف دیکھا۔ میں چہرہ دوسری طرف کر کے آنکھ کے کونے سے اُن کو دیکھتا رہا۔ وہ غور سے میرا چہرہ دیکھے جا رہی تھیں، میں ابا کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر اُنھوں نے ایک لمبی سانس لی۔ اُن کے ماتھے کے درمیان میں لکیریں اُبھری ہوئی تھیں اور مجھے اُن کے چہرے پر تشویش نظر آ رہی تھی۔ وہ اُٹھیں، تھوڑا جھجکیں اور پھر چولھے کی طرف چلی گئیں۔

مجھے کبھی محسوس ہوا کرتا تھا کہ یہ گھر نہیں ایک ہاسٹل ہے۔ یہاں سب انفرادی زندگی گزار رہے تھے اور جب سے خواجوں کو بلانے کا فیصلہ ہوا، ہاسٹل، گھر میں تبدیل ہو گیا۔ میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ تبدیلی کیوں آئی؟ شاید اِس تبدیلی کی وجہ وہ بحث تھی جو خواجوں کو دعوت دینے کے سلسلے میں ہوئی۔ اُس بحث میں ہر ایک نے اپنی رائے دی تھی اور میرے خیال میں اُسی گفتگو نے گھر کے ماحول کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ میرے اندر یہ خواہش اُبھری کہ اب گھر میں اسی طرح اجتماعی زندگی جاری رہے۔ کیا اماں جان دعوتوں کی متحمل ہو سکیں گی؟

''بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' اماں جان نے چولھے کے پاس سے آواز لگائی۔ ابا نے میری طرف دیکھا، میں پہلے ہی اُن کے فیصلے کا منتظر تھا۔

''بھوک تو نہیں ہے لیکن کھا لیں گے تا کہ تم آرام کر سکو۔'' ابا نے اپنا فیصلہ سنایا۔

میں جب اوپر گیا تو نوید وہاں پہلے ہی کھڑی تھی۔ خوش ہونے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح میں گھبرا بھی گیا۔ گھبراہٹ شاید میری خوشی کی انتہا تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اندھیرے میں تھی اور ہم سے دور گھروں کی چھتوں کے بلبوں نے گہرے اندھیرے کو اتنا روشن کر رکھا تھا کہ وہ ایسے کھڑی ہوئی نظر آتی تھی کہ میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ گلی کے پار، میرے سامنے تھی، میری منتظر۔ میرا جی اُسے لپٹنے کو چاہا۔ میں حیران تھا کہ کچھ دنوں سے کام دیتا مجھے مسلسل اُکسا رہا تھا اور مجھے نوید سے ملنے میں جو ایک لذت بھری جھجک اور خوف ہوتا تھا، وہ اب جاتے رہے تھے۔ میں اُسے اپنے ساتھ لگانے کے لیے بے چین تھا۔

وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور میں جانتا تھا کہ مسکرا رہی ہے۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی اور اُس کی مسکراہٹ میں چمک کا عکس تھا۔ کیا وہ رات کو سوتے میں مسکراتی تھی؟

''ایک بات تو بتاؤ!'' میں نے اپنی نظر کو اندھیرے کا عادی ہونے کے بعد پوچھا۔

''مجھے اچھا لگا کہ تم کچھ جاننا چاہتے ہو۔'' وہ ہنس رہی تھی۔

''اب دو باتیں ہو گئیں۔'' ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔

''تم رات کو سوتے میں بھی مسکراتی ہو؟''

''ہاں!'' وہ ہنسے جا رہی تھی۔

''کیوں؟'' میں بھی متجسس سی ہنسی ہنس رہا تھا۔

''تا کہ اگر سوئے ہوئے مر جاؤں تو اُس وقت بھی خوب صورت لگوں۔'' اب وہ سنجیدہ تھی۔

میں کچھ پریشان ہوا اور وہ میری پریشانی محسوس کرتے ہوئے ہنس پڑی۔ ''اب دوسری بات پوچھو؟ پھر میں نے بھی کچھ پوچھنا یا جاننا ہے!'' وہ پھر سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''تم اتنا مسکراتی ہو، کیا مسکرانے سے تمھارے ہونٹ تھکتے نہیں؟''

وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔ کیا اُسے میرا پوچھنا پسند نہیں آیا تھا؟ ''میں بہت خوش ہوئی ہوں۔ مجھے اچھا لگا۔'' اُس کی آواز میں اُداسی تھی۔ اُس نے آہ سے ملتی ایک لمبی سانس لی جس نے مجھے بھی پریشان کر دیا لیکن میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ''مجھے ایسے سوال کسی نے کبھی نہیں کیے اور شاید کوئی کرے بھی نا۔'' میں بھی اُداس ہو گیا۔ وہ خاموش تھی اور میں بھی!

''تم کچھ پوچھنا چاہتی تھیں؟'' میں نے اُداسی کے اندھیرے میں اپنے سوال سے ایک روشنی کرنے کی کوشش کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے کھچاؤ سے باہر آ گئی ہے۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔

''تم آج پھر بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ باہر چلے گئے!'' میرا جی قہقہ لگانے کو کیا۔ میں نے انگلیوں سے بالوں میں کنگھا کیا تھا اور سارا دن اِسی طرح اُنھیں ٹھیک کرتا رہا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں نے اُس کو اپنے بال ترتیب سے رکھنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اب میں اُسے کیا جواب دیتا؟ میں دل چسپی سے مسکراتا رہا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی؛ میرے جواب کے انتظار میں۔

''اچھا؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں غلط بیانی نہیں کیا کرتی۔'' اُس کی سنجیدگی میں سردیوں کی راتوں کی ٹھنڈک تھی۔ مجھے بات کو سمیٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

''صبح جب آؤ گی تو میرے بال دیکھ لینا۔'' میں نے اپنے لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اپنے بال ٹھیک سے نا بنائے تو تو میں......'' اُس نے دانت بھینچتے ہوئے بات شروع کی۔ اُس کی آواز میں بناوٹی غصے اور گہرے پیار کا رنگ تھا۔ میں نے اُس کی بات کاٹی۔

''تو کیا.....؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ جیسے بھی ہو گے، قابلِ قبول......'' وہ ہنس پڑی۔

''قبول یا قابلِ قبول؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ میں بھی انجانے میں مشکل سوال کر گیا تھا۔

''قبول!'' اُس نے لمبی سانس لی اور چلی گئی۔
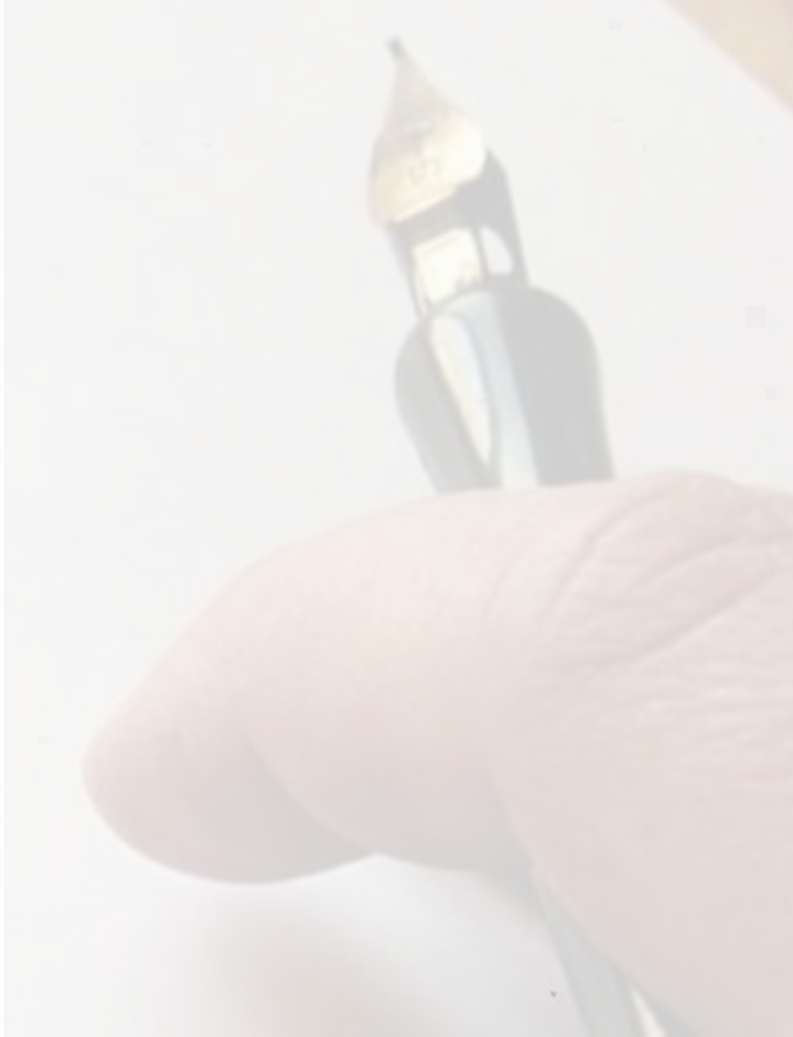
صبح نیچے جانے سے پہلے آئینے میں مَیں نے اپنا چہرہ غور سے دیکھا اور بالوں میں کنگھا کیا۔ میں کنگھا کم کرتا تھا اور تیل لگاتا ہی نہیں تھا جس کی وجہ سے میرے بال ہمیشہ ہلکے اور پھولے ہوئے ہوتے۔ میں جب نیچے گیا تو وہاں ایک مختصر سا ہنگامہ برپا تھا۔ ابا شیو کرنے مصروف تھے۔ میرے بھائی تیار، اُنھوں نے عید پر بھی اِس طرح کبھی تیاری نہیں کی ہوگی۔ وہ لائف بوائے صابن کو خوب مل کر نہائے تھے۔ اُنھوں نے ڈرائی کلینز کے دھلے ہوئے ایک ہی طرح کے چمکتے ہوئے لباس پہنے ہوئے تھے، سفید قمیصیں اور خاکی پتلونیں۔ اُنھوں نے تبت ٹالکم پاؤڈر کا اپنی بغیر بالوں کے بغلوں اور چھاتیوں پر مبالغانہ چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ سکول سے آنے کے بعد وہ گھر میں ہی بند رہتے تھے اور اُن کے لیے یہ خواجوں کے گھر جانے سے بھی بڑی تقریب تھی۔ میں نے کھلے پائینچوں والا پاجامہ اور کرتہ پہنا ہوا تھا اور ابا جب تیار ہو کے آئے تو وہ سفید کرتے کے نیچے تنگ موری والا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اماں جان نے شاید تیاری نہیں کرنی تھی کیوں کہ وہ ابھی تک چولھے کے آگے ہی بیٹھیں ماسی کو ہدایات دیے جا رہی تھیں۔

جب دھوپ آدھے صحن میں سکڑ گئی اور باقی آدھے پر سایہ پھیلنے لگا تو خواجے ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ خواجہ محبوب اور اُس کی بیوی نے مسکرا کر ہم سب کی طرف دیکھا۔ نوید کاسنی رنگ کا کھلا سا کرتہ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کے نظر جھکا کے سلام کیا؛ میرا جواب بھی اسی طرح کوڈ میں تھا۔ اُن کے آتے ہی گھر کا ہنگامہ یک لخت خاموش ہو گیا اور اُسی وقت میرے بھائی باورچی میں گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے چلا گیا، میں جانتا تھا کہ مہمانوں کو شربت پیش کیا جائے گا۔ اماں جان نے سکنجبین کے چار گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک ایک گلاس اُٹھا لیا۔ میرے بھائیوں نے خواجوں اور

ابا کو گلاس پیش کیے جب کہ میں نے نوید کو۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنایت سے مسکرائی، مجھے اِسی مسکراہٹ کی ضرورت تھی۔ اُس کا کھلتا ہوا رنگ جو گھبراہٹ اور کسی حد تک شرماہٹ کی وجہ سے سرخی مایل ہو گیا تھا، کاسنی رنگ کے کرتے میں پیٹونیا کے کھلے ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ میں اپنے لیے بھی گلاس لے آیا۔

خواجہ کسیرا بازار میں واقع اپنی دکان کے بارے میں بتا رہا تھا، اُس کا بیٹا دکان کی مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکا تھا۔ وہ نا تو معذرت خواہ تھا اور نا ہی مطمئن کہ اُس کے کاروبار میں ناغہ نہیں ہوا۔ میں سمجھا کہ خواجہ کو باتیں کیے جانے کی عادت ہے، چاہے کوئی سُنے یا نا سُنے۔ ابا اُس کی باتوں پر کوئی رائے نہیں دے رہے تھے گو بظاہر اُن کی تمام تر توجہ اُسی پر تھی۔ نوید کی ماں تھوڑی دیر تو وہاں بیٹھی توجہ سے باتیں سننے کی کوشش کرتی رہی اور پھر اُکتا کر اماں جان کے پاس چلی گئی اور باورچی خانے سے دونوں کی دل چسپی اور اپنایت میں ڈوبی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے اُن پر حیرت بھی ہوئی کہ آدمی کو بے تکلفی کی اِس سطح تک آنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے جب کہ عورتیں دوسری ملاقات میں ہی قہقہوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

نوید وہاں بیٹھی اپنے پاؤں دیکھتی رہی اور پھر اپنی ماں کے اُٹھ جانے کے بعد اُس نے نظر بھر کے میری طرف دیکھا۔ مجھے اُس کی نظر خالی اور اُکتائی ہوئی لگی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ رات تک ہمارے ہاں آنے کی منتظر تھی اور اب میری طرف اُکتائی ہوئی نظر سے کیوں دیکھتی تھی؟ مجھے اچانک خیال آیا کہ میرے بال بکھر نا گئے ہوں۔ میں نے اُنھیں درست کرنے کے لیے انگلیوں سے کنگھی کی اور اُس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اِس بار مجھے اُداسی نظر آئی۔ وہ کیوں اُداس تھی؟ ایسا تو نہیں کہ اُس کی منگنی کی تاریخ طے کر دی گئی ہو؟ میں نے نظر بچاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا، وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے خواجہ اور ابو کی طرف دیکھا۔ خواجہ محلّہ شریف پورہ میں قتل کیے جانے والے اپنے عزیزوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اب ابا واقعتاً دل چسپی سے اُس کی باتیں سن رہے تھے۔ اِس بار میں نے بھرپور نظر کے ساتھ نوید کی طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں تو اُس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔ اُس کے گال سرخ ہو گئے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ عورت موقع کی مناسبت سے ہمیشہ غلط تاثر دیتی ہے۔ وہ میرے سامنے بیٹھے ہونے سے شاید بہت خوش ہو لیکن اپنی خوشی کو ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ اپنا آپ میرے حوالے کرنا چاہتی ہو لیکن اِس کے اُلٹ تاثر دے رہی ہو۔ کیا عورت

شادی سے تھوڑا پہلے اپنے آپ کو کسی غیر کے حوالے کر سکتی ہے؟ کیا جسمانی ملاپ محبت کا اختتام اور خواہش کا آغاز ہوتا ہے؟ اب ابا نے گھر کے مقدمے کی کہانی پہلی پیشی سے سنانا شروع کر دی جو وہ پچھلی مرتبہ بھی سنا چکے تھے اور اِس بار یقیناً کافی ردو بدل ہوگا۔ وہ ہر بات یا واقع کئی مرتبہ سناتے تھے؛ ہر بار نئی جگہ اور نئے لوگوں کے حوالے سے۔

ابا کی سنی ہوئی کہانی سنتے ہوئے میں نے نظر بچا کر پھر نوید کی طرف دیکھا؛ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری نظر ملی تو اُس کی آنکھوں میں خوشی میں ڈوبی ہوئی حیرت تھی جیسے بچے کو پہلی مرتبہ نیا کھلونا دیکھنے پر ہوتی ہے۔ ایسا تو نہیں کہ وہ بھی میری طرح میرے ساتھ شب بسری کا سوچ رہی ہو؟ اور اِسی طرح سوچتے ہوئے اُس کے دھیان میں میرا استر بھی آ گیا ہو! ابا کی باتیں سنتے ہوئے میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے ہونٹوں پر شرارت بھری مطمئن سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے بے لباس دیکھ چکی ہے۔ وہ اچانک متذبذب سی نظر آنے لگی۔ اُس وقت ابا گھر پہنچ کر ہمیں فیصلے کی نقل دکھانے تک چکے تھے۔ اُسی وقت خواجہ کی بیوی اور اماں جان باورچی خانے سے برآمد ہوئیں؛ وہ کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔

''آپ بیٹھیں، میں بس ابھی آئی۔'' اماں جان بغیر آواز پیدا کیے چٹکی بجاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

''ہوگئی کچہری؟'' خواجہ نے ناپسندیدگی سے کہا۔

''آپ خاموش بیٹھے رہے تھے یہاں کیا؟'' اُن کی بیگم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

میں نے نوید کی طرف دیکھا۔ وہ ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر شادی کے جلد بعد سینڈ و مر جائے تو کیا وہ میرے پاس آجائے گی یا میں اُسے قبول کرلوں گا ؟ اور اگر شادی کے بعد میری بیوی مر جائے تو کیا نوید اپنے خاوند کو چھوڑ کے میرے پاس آجائے گی؟ مجھے اچانک کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا کہ مَیں موت کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ میں نے پھر نوید کی طرف دیکھا؛ میں کچھ خوف زدہ سا تھا۔ وہ مجھے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر پریشانی، خوف یا اُلجھن کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مجھے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی۔ گھبراہٹ میں مَیں وہاں سے اُٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے سگریٹ کی حاجت محسوس ہوئی۔ میں نے میز کی دراز میں سے ٹوٹا نکالا اور

جلا کر لمبا کش لے کے دھواں پھیپھڑوں میں رکھ کے آہستہ آہستہ خارج کیا۔ مجھے ایسا کرتے ہوئے ایک گہرے سکون کا احساس ہوا اور میں نے سگریٹ بجھا کر اُسے کسی اور حالت میں سے سکون کشید کرنے کے لیے رکھ لیا۔ باہر آ کے میں نے نوید کے کھڑے ہونے والی خالی جگہ کی طرف دیکھا اور پھر ایک نظر بیل پر ڈالی۔ مجھے شک گزرا کہ اُس پھسلتی ہوئی نظر میں مَیں نے سانپ کو تیزی کے ساتھ پتوں میں چھپتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اپنے اور نوید کے درمیان میں گلی کو دیکھا۔ میں نے سوچا کہ اِس فاصلے کو ہماری سرگوشی کیسے پار کرتی ہوگی؟ فاصلہ اتنا کم نہیں تھا کہ سرگوشی اُسے پار کر جاتی؛ کیا اُس وقت کی سرگوشیوں میں محبت کی طاقت ہوتی ہے ؟ ہماری سرگوشی اتنی بلند ہوتی ہوگی کہ گلی میں کھڑا ہونے والا ہمیں سُن سکتا ہوگا۔

مجھے پھر سانپ نظر آیا اور میرے بدن میں خوف کی جھرجھری دوڑ گئی۔ اگر کسی دن سانپ نے نوید کو ڈس لیا تو.....!
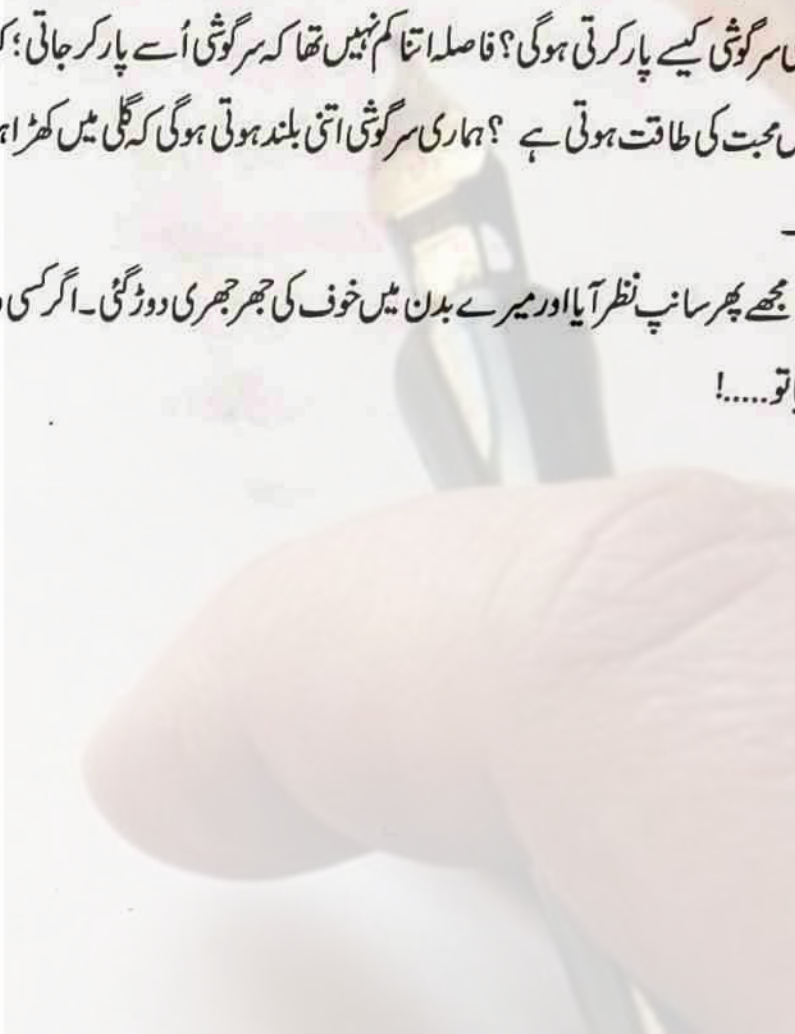
میں جب نیچے گیا تو سب کمرے میں چلے گئے تھے جہاں دری پر سفید چادریں بچھا دی گئی تھیں۔خواجہ محبوب اور ابو آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کی بیگم اور اماں جان اُن سے فاصلے پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔کمرے کے کونے میں ایک میز رکھی تھی جس کے گرد دو کرسیاں تھیں۔نوید دیوار والی کرسی پر بیٹھی ایک بیزار سی دل چسپی کے ساتھ سب کی باتیں سن رہی تھی۔کھانا لگانے اور پورا رکھنے کی ذمے داری ماسی اور بھائیوں پر تھی۔اماں نے مکمل ہدایات دے رکھی تھیں۔میرے بھائی بھاری بریانی کے دو تھال لے آئے۔میں نے باورچی خانے سے تھالی میں بریانی، بند گوبھی کے پکوڑے اور چٹنی ایک تھال میں رکھ کر نوید کے سامنے کر دیے۔اُس نے مجھے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔اُس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی؛ مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔میں اُسے نظر انداز کرتے ہوئے باورچی خانے میں گیا اور ایک تھالی میں سبزی اور دو چپاتیاں بھی نوید کے سامنے رکھ دیں۔اب ہر کوئی کھانے میں مصروف تھا۔نوید نے میری طرف ایسے دیکھا کہ مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا کہہ رہی ہو۔میں نے انکار میں سر ہلایا۔کمرے میں مکمل خاموشی تھی، صرف کھانے کو چبائے جانے کی آواز آ رہی تھی۔میں ایک تھالی میں بریانی ڈال کر ایک کونے میں فرش پر ایسے بیٹھ گیا کہ میں سب کو دیکھ سکوں۔وہ کھاتے ہوئے میری طرف ایک تعریفی نظر ڈال لیتی۔مجھے کھانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اُسی وقت مجھے چاول اپنے گلے میں اٹکتے ہوئے محسوس ہوئے۔میں باورچی خانے سے دو گلاس لے آیا، ایک میں نے نوید کے سامنے میز پر رکھ دیا۔اُس نے میری طرف دیکھا نہیں، وہ سر جھکائے کھانے میں مصروف رہی۔اُس وقت شاید سب کی نظر ہم پر تھی۔

اماں جان نے میری طرف دیکھا، میں اُن کی نظر کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیا اُنھیں میرا نوید کا خصوصی طور پر خیال رکھنا پسند نہیں آیا تھا یا وہ مہمانوں کو پتا چلتے بغیر کوئی کام بتانا چاہتی تھیں؟ میں نے اُن کی نظر کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر اُن کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگا۔ خواجہ محبوب نے خوب کھا کر کھانے کی تعریف شروع کر دی اور اماں جان سے بریانی اور سبزی پکانے کے نسخے جاننے کے لیے سوال پوچھنے لگے۔ اماں جان خوش تھیں؛ شاید اُنھیں اِس طرح اہمیت کبھی دی نہیں گئی تھی۔ وہ اِتراتے ہوئے، ابا کی طرف دیکھ کر، خواجے کے سوالوں کے جواب دینے لگیں۔ مجھے اماں جان کے لہجے اور طریقے میں خوشی کے ساتھ کامیابی کے عکس کی جھلک نظر آئی۔ ابا بھی اُنھیں مطمئن سے دیکھتے ہوئے خوشی سے مسکرائے جا رہے تھے۔ نوید اپنی جگہ پر بیٹھی بولنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مجھے کچھ لاتعلق سی بھی لگی؛ شاید اُسے میرا اپنے پاس نا بیٹھنا پسند نہیں آیا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو چائے کا دور شروع ہوا۔ نوید نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ اُس کی ماں نے بتایا کہ وہ صرف دودھ پتی پیتی ہے۔ اماں جان نے میری طرف دیکھا اور اِس بار میں اُن کی نظر کی زبان سمجھ گیا۔ ماسی کو بتا کر میں جلدی سے دودھ پتی بنا لایا جسے نوید نے کسی تاثر کے بغیر میرے ہاتھ سے لیا۔

مجھے نوید کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس کے ہونٹ باریک، خون میں رِسے ہوئے، آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ میری نظر بار بار اُس کے ہونٹوں کی طرف اُٹھ رہی تھی اور مجھے ہر بار خیال آتا کہ کیا اُس کے ہونٹوں میں خون کے نمک کا ذائقہ ہو گا یا محبت کے رس کی مٹھاس؟ میں اپنی نظر اور سوچ کے چغلی کھا جانے سے پہلے ہی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کیا میں نہیں چاہتا تھا کہ حال، زندگی کے ختم ہونے تک جاری رہے؟ وہ کرسی پر بیٹھی کبھی چوری اور کبھی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھتی تھی؛ کیا میں اُس کے دیکھنے سے خائف تھا؟ مجھے کمرے میں آ کے ایک عجیب طرح کی اجنبیت کا احساس ہوا۔ کمرہ میری پناہ گاہ رہا تھا، مجھے یہاں آ کر سکون بھری اپنایت کا احساس ہوتا لیکن آج مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سامنے سہرا بیل کی طرف دیکھا تو مجھے وہ بھی پریشان حال لگی۔ اُسی وقت مجھے ایک ہی شاخ سے لپٹے ہوئے دونوں سانپ نظر آئے جو تیزی کے ساتھ اپنی زبانیں چلاتے ہوئے جھوم رہے تھے۔ مجھے وہ خوش نظر آئے۔ مجھے اُن کی زندگی پر ترس آیا جو اُسی درخت تک محدود تھی۔

میں نے ایک لمبی سانس لی اور نیچے اُتر آیا۔ نوید کرسی پر اُسی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے دیکھتے

ہی اُس کی آنکھیں مسکرا اُٹھیں اور یہ بھی احساس ہوا کہ وہ میرے انتظار میں تھی۔ اب اماں جان چھور سے میر پور خاص تک کا چھوٹی لائین پر اپنے ریل گاڑی کے سفر کا حال بتا رہی تھیں۔ خواجہ محبوب اور اُن کی بیگم کو شاید چھوٹی لائین کے بارے میں علم نہیں تھا اور وہ حیرت میں ڈوبی دل چسپی کے ساتھ اُن کو سن رہے تھے۔ میر پور خاص ریلوے سٹیشن پر اُتر کر ریل گاڑی تبدیل کرتے ہوئے جو مشکلات پیش آئیں وہ میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ اُس سارے صبر آزما عمل میں اُنھیں میری بھی پریشانی تھی کہ میں اُن کی اُنگلی چھڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سنتے ہوئے نوید میری طرف دیکھ کے محبت بھری اپنایت سے مسکرائی۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔ شاید اُسے یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر میں اُنگلی چھڑا جاتا تو!

''بہن جی! ہم کھانے کے شوقین ہیں اور آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ایسا کھانا کبھی نہیں کھایا۔ آپ نے تو ایسا ماحول بنا دیا کہ لطف آ گیا۔'' خواجہ محبوب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کی بیوی نے ناگواری کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔ یا تو اُسے کھانے کی تعریف پسند نہیں آئی تھی اور یا خواجہ کا اتنی جلدی اُٹھ جانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''کھانا تو وہ تھا جو ہم آپ کے ہاں سے کھا کے آئے تھے۔'' اماں جان نے اُن کی بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے خواجہ محبوب سے کہا۔ ''ہم نے تو بس دال روٹی کا اہتمام کیا ہے۔'' اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جس کی وجہ میں تب نہیں جان سکا۔ نوید نے اُس رات بتایا کہ اُنھیں اہتمام کا مطلب سمجھ نہیں آیا تھا۔ اُن کے اُٹھ جانے سے میں بھی پریشان ہوا۔ ہم جھجک کی وجہ سے ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے اپنی اور کبھی اجنبی لگتی تھی؛ اُس اجنبیت میں بھی ایک اپنا پن تھا۔ وہ میرے اتنا قریب تھی کہ میں اُس کی شفاف گردن میں نیلی رگوں کی باریک لکیریں تب دیکھ سکتا تھا۔

وہ سب اُٹھ گئے۔ نوید نے میری طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھکا کر سلام کیا جس کا جواب میں نے اپنا ماتھا چھوتے ہوئے دیا۔ اُس شام نوید نے سیٹی کے بجائے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں کرسی پر نیم دراز اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں ایک لاپروا اور درمیانہ طالبِ علم تھا۔ کیا آنے والے دنوں میں میرے جیسے طالبِ علم کو کوئی مواقع مِل سکیں گے؟ میں نے ابھی تک کتابوں کو چھوا تک نہیں تھا

لیکن مجھے اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اُس کی آواز نے مجھے ایک طرح گہری نیند سے جگا دیا۔ مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرتے ہوئے کچھ وقت لگا تو اُس نے دوسری آواز دی۔ اِس بار آواز زیادہ بلند اور واضح تھی۔ میں تیزی کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور ابھی اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا کہ ہر کوئی اُس کے اندر چھپ جائے۔ مجھے اُس کے اِس طرح بے باکانہ کھڑے ہونے پر حیرت بھی ہوئی۔ وہ گلی کے دوسرے کنارے پر میرے سامنے کھڑی تھی، اُس مسافر کی طرح جس کی کشتی ابھی بھری نا ہو۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''تم نے اتنی اونچی آواز کیوں دی؟'' میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''تا کہ تم سُن سکو۔'' اُس نے میری پیچیدگی کو غیر اہم بنا دیا۔ اُس کے چہرے پر اچانک خوشی کے بلبلے سے پھوٹ پڑے۔ اُس کا چہرہ بادلوں کے موسم کی طرح تھا جہاں سورج منظر بدلتا رہتا ہے۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے کبھی اُسے ایسے انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ مجھے کچھ پریشانی بھی ہوئی۔ ''بعض اوقات یہ خواہش اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ میرے کندھے کھچ جاتے ہیں اور سر بھاری ہو جاتا ہے۔'' اُس نے پہلے کبھی اتنی شدت سے اپنے احساسات کا اقرار نہیں کیا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی آواز تھکی تھکی اور کسی حد تک مایوسی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔

''تمھارے گھر والوں نے گرمیوں میں چھت پر سونا ہے اور تم رات کو چپکے سے میرے گھر آجایا کرو گی اور ہم یہاں رات گزارا کریں گے۔ صبح مولوی کی اذان سے پہلے تم اپنے گھر چلی جاؤ گی۔'' میں نے اِس مشکل عمل کو جتنا آسان بنانا ممکن تھا، بنا کے کہا۔

''میں نے تو کہا تھا کہ تم میرے گھر آنا۔'' اُس کی آواز میں جارحیت تھی۔

''تم نے کہا تو تھا۔'' مجھے اقبال غوری کا مشورہ نا صرف یاد تھا بلکہ منطقی بھی لگا تھا۔ ''اگر میں آؤں تو تمھیں میرا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمھارے گھر والے کب اوپر جائیں؟ میرے یہاں ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ سب لوگ اپنے کمروں میں سوتے ہیں۔'' میں نے اِس سنجیدہ مسئلے کو مزاحیہ رنگ دینے کی کوشش کی، ''جب جی کرے آجانا اور جب اُکتا جاؤ چلے جانا۔''

نوید نے فوری جواب نا دیا اور میں نے بھی اُس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم کچھ دیر

خاموشی کو گلے لگائے رہے۔

''میں آؤں گی۔'' اُس نے فیصلہ سنا دیا جس سے نا صرف مجھے، اُس کو بھی ایک خوشی اور چھٹکارے کا احساس ہوا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کیا وہ آ پائے گی؟ میں نے بات چلائی:

''اپریل ختم ہونے کو ہے اور مئی کے پہلے ہفتے میں راتوں کو چھتیں آباد ہو جاتی ہیں۔ ہماری ملاقات دور نہیں ہے۔'' مجھے ہر بار شک رہتا کہ وہ نہیں آئے گی اور میں تصدیق کے لیے ایسے سوالات پوچھتا رہتا تھا۔

''مجھے کمرے میں کیسے لاؤ گے؟'' اُس کا سوال منطقی تھا۔ میں نے یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میری سوچ کا آغاز اُس کے کمرے میں موجودگی سے ہوتا تھا۔ کیا وہ واقعی ہی سنجیدہ تھی یا یہ گفتگو برائے گفتگو تھی؟

''میں ڈیوڑھی میں تمھارا انتظار کروں گا اور تم اتنا آہستگی کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹاؤ گی کہ وہاں کھڑا میں ہی سن سکوں۔ پھر تم میرے پیچھے پیچھے، جُڑ کر اِس طرح چلنا کہ ہم ایک ہی لگیں۔ رات کے کسی آخری پہر میں اِسی طرح تمھیں گلی میں پہنچا دوں گا۔'' کیا یہ اتنا ہی آسان ہوگا؟ میں جانتا تھا کہ ہر آسان لگنے والا کام اُتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ نظر آتا ہے۔

''ایک بات تو بتاؤ؟'' میں نے پوچھ کے وقفہ دیا تا کہ وہ اپنے آپ کو تیار کر لے۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں اُس کے چہرے پر سوالیہ تاثر دیکھ سکتا تھا۔ ''جب تم میرے پاس آؤ گی تو ہم کریں گے کیا؟'' میں یہ اُس سے کئی مرتبہ پوچھ چکا تھا۔

''باتیں!'' اُس نے بے زاری سے کہا۔ مجھے اُس کے لہجے سے حیرت ہوئی؛ وہ ہمارے گھر میں اُٹھنے تک تازہ اور خوش رہی تھی۔ اب اچانک اُس کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں؟

''باتوں کے بعد؟''

''مزید باتیں۔'' اِس بار اُس کی آواز میں شگفتگی تھی۔ میں کیا جواب دیتا؟ کیا وہ مجھے مہرے کے طور پر استعمال کر رہی تھی یا وہ میرا مہرہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں لیکن منطق دیوار کی طرح سامنے کھڑی ہو جاتی۔ میں سوچتا کہ جذبات زیادہ منطقی ہیں یا منطق زیادہ جذباتی؟ کیا منطق جذباتی ہو سکتی ہے؟ ایسے احمقانہ خیالات محبت کی شدت میں ہی آ سکتے ہیں؟ کیا وہ اپنا منگیتر چھوڑ

سکتی ہے؟ اگر وہ چھوڑ دے تو میرے والدین اُسے اپنانے کو راضی ہو جائیں گے؟ اماں جان کو یقیناً اعتراض نہیں ہوگا لیکن ابا کا ثقافتی ورثہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ پنجاب میں ذات پات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے اپنے مقامی ہم ذاتوں کو نچلے درجے کے ہم ذات سمجھتے تھے اور اُنھیں سماجی اور اخلاقی طور پر اپنے برابر نہیں گردانتے تھے اور اس طرح مقامی بھی! کشمیری ذات پات کے اتنے پابند نہیں ہوتے اور شاید مان جائیں۔ کیا وہ نوید کی پہلی منگنی توڑنے کے لیے رضامند ہو جائیں گے؟

''کیسی باتیں؟'' میں شاید کہیں دور سے بولا تھا اور نوید تک میری آواز نہیں پہنچی تھی۔ ''کیسی باتیں؟'' میں نے قدرے بلند آواز میں دہرایا۔

''آہستہ!'' مجھے لگا کہ اُس نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا ہے۔ ''چھاپہ ڈلوانا ہے۔'' پھر وہ تھوڑا سا ہنسی، ''جیسی باتیں کرتے ہیں۔ دوستوں کی، کالج کی، رشتے داروں کی، کچھ غیر اہم اور کچھ اہم۔ جیسی باتیں کرتے ہیں، ویسی۔'' اُس نے باتوں کی تشریح تو کر دی لیکن میں اُس کے لہجے میں سے تاثرات کشید کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا لہجہ مجھے بے تاثر اور خالی خالی سا لگا۔ مجھے مایوسی بھی ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کرسی پر بیٹھی کئی قسم کے تاثرات دیے جا رہی تھی اور اب اچانک اتنی اُکتائی سی کیوں محسوس ہوئی؟ کیا تمام لڑکیاں ایسے ہی ہوتی ہیں؟ میں عنبر کے علاوہ کسی اور لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے کسی اُلجھن والے لمحے میں عنبر کا خیال کیوں آتا ہے؟ کیا اُس کا جسم میری سوچ کے کسی اندھیرے کونے میں بس رہا ہے؟

''تم کیسی باتیں کرنی چاہو گے؟'' مجھے اُس کے لہجے میں شرارت کا ہلکا پن محسوس ہوا۔ اب میں کیا جواب دیتا۔ میں اُکتایا ہوا بھی نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔

''جو دونوں کو اچھی لگیں۔'' میں نے درمیانی راستہ چنتے ہوئے کہا۔

''اب جانے کا وقت ہے۔'' جواب کا انتظار کیے بغیر وہ چلی گئی!

کچھ دنوں کے بعد خواجہ محبوب کی چھت آباد ہوگئی اور میرا نوید کے ساتھ رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ لوگ رات کے کھانے کے بعد چھت پر آتے اور میرے جاگنے سے پہلے چلے جاتے۔ میری حالت اُس مسافر کی سی تھی جو تیز آندھی میں آنکھیں کھولے راستہ تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں ہو۔ میں رات کو اُن کے آنے کے بعد ڈیوڑھی میں کھڑا رہتا کہ نوید کی نا سنی جانے والی دستک سن سکوں۔ اُس نے شاید نہیں آنا تھا اور میں وہ مہرہ تھا جسے گرمیوں میں چلایا نہیں جاتا۔ کیا مجھے موثر ہونے کے لیے سردیوں کا انتظار کرنا ہوگا؟

میں معمول کے مطابق نوید کو ہر صبح تانگے میں سوار ہوتے دیکھتا اور خواجہ محبوب اور میں ایک دوسرے کو مشکوک سی نظر سے دیکھتے۔ نوید مجھے ہمیشہ کی طرح پلکوں کا سلام کرتی اور میں جوابی سلام میں کبھی ناکام بھی ہو جاتا۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ تازگی اور رونق ہوتی اور مجھے کبھی محسوس نا ہوتا کہ وہ رابطہ نا کرنے پر کسی طور شرمندہ یا احساسِ جرم کا شکار ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر ناراضی اور اُکتاہٹ کے تاثرات کا احساس ہوتا۔ میں سوچتا: کیا محبت میں ملنا ضروری ہے؟ کیا محبت ملاقاتوں کا تسلسل ہے اور اگر یہ قائم نا رہے تو ختم ہو جاتی ہے؟ کیا ہماری محبت ختم ہو جائے گی؟ کیا میں نوید سے محبت کرتا ہوں یا اُس کی جسمانی کشش مجھے مائل کیے ہوئے ہے؟ ایسے کئی الجھاوے مجھے پریشان رکھتے اور میرے سر میں درد رہنے لگا۔ میں راتوں کو اپنے کمرے کے باہر ٹہل لیا کرتا تھا، خواجہ خاندان کے چھت پر آنے کے بعد میں کمرے میں بند ہو کے رہ گیا تھا اور مجھے کمرہ اجنبی سا لگنے لگا۔ میرے دِن نوید سے ملنے کے انتظار میں کٹا کرتے تھے اور اب اُس سے ملنے کی اُمید ختم ہونے کے بعد اُمید بھرے دن بیکار لگنے لگے۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک

خلا کا احساس ہونے لگا۔

میں ایک نا اُمیدی کی زندگی گزارنے لگا۔ میں نوید کو دیکھ تو رہا تھا اور اُس کی مسکراہٹ مجھے مسحور بھی کرتی لیکن میں اُس سے مل نہیں پا رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہو جاتا کہ نوید نہیں آئے گی تو میں گھر سے نکل کر شہر کے خالی بازاروں میں گھومتا۔ یہ وہ بازار تھے جہاں سارا دن گہما گہمی رہتی اور اب کوئی آوارہ کتا، گائے، نشئی، بے گھر یا میں وہاں گھوم رہے ہوتے۔ تنگ گلیوں کی دیواریں اندر کی طرف جھکنا شروع ہو گئی تھیں اور مکان بوسیدہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُن گھروں کے اندر رہنے والے لوگ روشنی سے واقف نہیں تھے۔ میں اُن گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک خوف کا شکار ہو جاتا۔ مجھے یہ پرانا شہر اپنی ٹیڑھی گلیوں، جھکتی ہوئی عمارتوں اور سیلن زدہ دیواروں کی وجہ سے رہائش کے لیے صحت مند نہیں لگتا تھا۔ کیا اِس کی تعمیرِ نو کی ضرورت تھی؟ اگر تعمیرِ نو ہوئی تو پرانے شہر کا کیا بنے گا؟ اِن جھکتی عمارتوں، ٹیڑھی گلیوں اور سیلن زدہ دیواروں کی ایک تاریخ تھی۔ تاریخ تو اُس شہر کی ہوتی ہے جو جل کے آباد ہوا ہو، جو اپنی راکھ میں سے زندہ ہو کے خود، اپنی ہی طاقت کے بل بوتے پر، زندگی پا گیا ہو۔ دہلی اور لاہور جل کے آباد ہوئے ہیں، میرا شہر نہیں۔ اِس میں زندگی اپنی دھیمی رفتار سے چلتی رہی، معمولی ہلچل صرف سکھوں کے دور میں ہوئی جب وہ کابل تک پہنچ گئے تھے لیکن یہاں رفتار دھیمی ہی رہی۔ مجھے یہ ٹیڑھی گلیاں، جھکی ہوئی عمارتیں اور سیلن زدہ دیواریں پسند ہیں، اِن کی خستگی میں ایک تازگی تھی اور یہی تازگی مجھے ہر روز ان ویران گلیوں میں لے آتی۔ یہ وہ زندگی تھی جو جدید آبادیوں میں نہیں تھی۔

لو چل رہی تھی اور میں گرمی کی پروا کیے بغیر اپنے کمرے میں تھا۔ چیاں والی کا بنگلہ میرے فرار کی پناہ گاہ تھی جسے میں بھول چکا تھا، شُمر زیدی میرا راز دار تھا اور میں اُس سے ملنے سے کترا رہا تھا جب کہ اقبال غوری صلاح کار تھا اور میں اُس سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا۔ کیا یہ سب نوید کی وجہ سے تھا؟ میں اُس لو میں اپنے کمرے میں محبت کے زخم چاٹ رہا تھا۔ سن رکھا تھا کہ چاٹنا ہی اِن زخموں کا پھاہا تھا اور مجھے یہ بات غلط بھی نہیں لگی۔ میں ہر وقت نوید کے بارے میں ہی سوچتا اور جتنا سوچتا وہ اُتنا ہی یاد آتی۔ میں اُس لُو میں جب پیاس گلا خشک کر دیتی ہے، جب پسینہ جسم کو اپنی کڑوی بو سے بھر دیتا ہے اور گرمی کی شدت سے سر چکرا رہا ہوتا ہے، کمرے میں اُمید کو تھامے بیٹھا ہوا تھا کہ نوید کی آواز یخ بستہ وادیوں کی ٹھنڈک لے کے آئی۔ میں نے سامنے دیکھا، وہ بیل کے سائے میں متذبذب سی کھڑی تھی۔ جہاں اُس کا آنا میرے لیے

گہرا سکون لیے تھا، اُس کا اضطراب پریشانی کا سبب بھی تھا۔ میں جھجکتا ہوا اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر گہری خاموشی رہی۔ پھر اُس نے اعتماد بحال کرنے کے لیے ایک پاؤں سے دوسرے پر اپنا وزن بدلا۔

''میں رات کو آؤں گی۔'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں ایک عرصے سے یہی سننا چاہتا تھا اور سنتے ہی بے یقین سا ہو کر خوف زدہ ہو گیا۔ ڈیوڑھی سے یہاں اوپر کمرے تک لانا جو ایک معمولی عمل لگا تھا ایک دم ناممکن سی بات لگنے لگا۔ میں گھبراہٹ میں اُسے دیکھتا رہا اور مجھے اُس میں بھی اعتماد کی کمی کا احساس لگا۔ پہلی مرتبہ تھی کہ مجھے اُس کے جانے کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے ساری شام کھچاؤ میں گزاری۔ میں نے اُس سے آنے کا وقت پوچھا ہی نہیں تھا۔ اُن کی رات مغرب کے فوراً بعد ہو جاتی تھی اور ہماری رات آٹھ بجے کی خبروں کے بعد! اور اگر شکیل احمد نے خبریں پڑھیں ہوں تو ابا چند منٹ اُن کی نقل اُتارتے اور ارد گرد کی اہم خبریں ویسے ہی انداز میں پڑھتے۔ عین ممکن تھا کہ نوید اُس وقت دروازہ کھٹکھٹاتی۔ اگر ایسا ہوا تو میں کیا کروں گا؟

ساری شام کھچاؤ میں گزری!

خبریں انور بہزاد نے پڑھیں۔ خبریں ختم ہوتے ہی ابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور اُن کے پیچھے اماں جان بھی۔ میں نے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مل کر کرسیاں کمرے میں رکھیں؛ میں عموماً یہ کیا نہیں کرتا تھا۔ اُن کے خیال میں مَیں نے آدھی رات کے معمول کے مٹرگشت پر نکلنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر خاموش ہو گیا۔ بند گلی میں ہمارے گھر ایسے واقع تھے کہ نوشہرہ روڈ کا ٹانگوں اور ریڑھوں کا شور کبھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے اچانک اُس خاموشی سے خوف آنے لگا۔ میں ڈیوڑھی میں کھڑا اِس دم گھونٹتی خاموشی میں نوید کی دستک کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے رواز ے کو کھر چے جانے کا شک ہوا۔ میری حالت اُس زندہ آدمی کی سی تھی جس کی جان نکل گئی ہو۔ اگر بلی کے بجائے نوید نے دروازہ کھر چا ہو تو.....! مجھے لگا کہ ساری رات دیکھے جانے والا دل چسپ خواب اچانک ختم ہو گیا ہے۔

میں نے بے یقینی اور کم اعتمادی کے ساتھ دروازہ کھولا۔ مجھے کسی طرح یقین تھا کہ نوید دروازے کے اُس طرف نہیں ہو سکتی لیکن اِس اعتماد میں کہیں ایک بے یقینی تھی کہ وہ میرے سامنے کھڑی ہو گی۔ میں نے نا قابلِ بیاں کیفیت سے دروازہ کھولا تو وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے یقین نہیں

آیا۔ میں بے بس سا کھڑا تھا اور وہ اندر آ گئی۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اُس کی آواز سے خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اِسے کہیں نوید نا سن لے۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا اور ٹانگیں میرا بوجھ نہیں اُٹھا پا رہی تھیں۔ میں نے نوید کی طرف دیکھا کہ شاید اُس کی بھی میرے والی ہی حالت نا ہو؟ مجھے خیال آیا کہ وہ گلی پار کر کے آئی تھی، اِس لیے اُسے نا خوف ہوگا اور نا ہی رعشہ! مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا اور ترس بھی۔ ڈیوڑھی کے مرطوب سے اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ ہم نے اوپر میرے کمرے میں جانا ہے۔ ہم ڈیوڑھی کی حفاظت میں اتنے غیر محفوظ تھے جتنا کہ گلی میں ہو سکتے تھے۔ میرا جسم پسینے میں تر تھا۔ مجھے نوید کی ذہنی حالت کا علم نہیں تھا کہ وہ بلی۔ مجھے یک دم محسوس ہوا کہ میرے دل کی دھڑکن معمول کے مطابق تھی، میرے ہاتھوں میں رعشا نہیں تھا اور میری ٹانگیں آسانی کے ساتھ مجھے اُٹھائے ہوئے تھیں۔ میں نے ایک لمبی سانس لی۔ مجھے کچھ بھی غیر معمولی نا لگا۔ میں اُس کے کان کے اوپر جھکا، اُس کے بالوں میں سے ناریل کے تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے ایک سانس لی اور کان کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا: ''میرے پیچھے آؤ''

کمرے میں پہنچ کر نوید نے دروازے کو بند کر دیا!

اُس کا سر میری چھاتی پر تھا اور Forhans ٹوتھ پیسٹ کی خوشبو والی سانسیں میری برہنہ چھاتی کو سہلا رہی تھیں۔ میں اُس کے مخمور سے بلی خراٹے سنتے ہوئے جاگ رہا تھا۔ میں اُس کو اپنے پہلو میں سلائے مختصر سی رات کو ابدی طوالت دے کر مولوی کی اذان سے پہلے تک جاگنا چاہتا تھا۔ میں مطمئن تھا اور اِسی اطمینان کی بے چینی مجھے جگائے ہوئے تھی کہ میں بھی شاید اُس کے بلی خراٹوں کے ردھم میں بہہ گیا کہ اچانک تیز روشنی میری آنکھوں میں چبھی؛ چھت کا بلب اچانک روشن ہو گیا تھا!

آج میری سترویں سالگرہ ہے، میری عمر کے لوگوں کی زندگیوں میں یہ سالگرہ بہت اہم ہوتی ہے کیوں کہ یہ زندگی کے اختتام کی طرف آخری جست ہوتی ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے میں گوجرانوالہ چھاؤنی سے ملحقہ ڈی سی کالونی میں آباد ہوں اور اپنی ہر سالگرہ وہیں مناتا ہوں جب کہ میرے خاندان نے میری مرضی کے خلاف اِس اہم سالگرہ کو اپنے نوشہرہ روڈ والے آبائی گھر میں منانے کا فیصلہ کیا۔ میں گوجرانوالا ڈسٹرکٹ کورٹ بار کا اپنی ریٹائرمنٹ تک ایک کامیاب وکیل تھا۔ میں دو بار بار کا صدر بھی رہ چکا ہوں۔ میرے بھائی اِس گھر کو بیچنا چاہتے تھے لیکن میں نے اِسے خرید کر اپنے خاندان کی تاریخ کی بنیاد ڈالی۔

میرے دونوں بیٹے، بیٹی، پوتے، پوتیاں، نواسی اور نواسا اِس سالگرہ پر اکٹھے ہیں۔ آج اِس پرانے گھر کے صحن میں اِک شور برپا ہے اور میں اچانک اپنے آپ کو اِس شور کا حصہ نا سمجھتے ہوئے ڈیوڑھی میں سے ہو کر چھت پر آ جاتا ہوں، نصف صدی پہلے والی ایک رات کی طرح۔ سامنے والا گھر اگلی صبح ہی خالی ہو گیا تھا اور اب تک وہاں کوئی آباد نہیں ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ویران گھروں پر مکینوں کی روحیں قابض ہو جاتی ہیں۔ سہرا بیل ختم ہو گئی تھی اور سانپ شاید سو سال کی زندگی کے بعد انسان کا روپ دھار کر کہیں جا چکے تھے۔ بیل کے بغیر چھت اجنبی اور ویران لگ رہی تھی۔ اِسی بیل کے سائے میں اُس رات خواجہ محبوب، اُس کی بیوی اور بیٹا جاگ رہے تھے جب کہ ہم اُنھیں سویا ہوا سمجھے اور یا وہ سو ہی رہے تھے؛ سانپوں نے ہماری مخبری کر دی تھی!

مجھے لگا کہ سامنے والے گھر پر نوید کی روح قابض ہے۔ میرے جسم میں خوف اور پچھتاوے

کی جھرجھری دوڑ گئی۔ میں اُسے اپنے سامنے کھڑی دیکھنا چاہتا تھا؛ میرے کان بھولی ہوئی سیٹی کو سننے کے لیے ترسنے لگے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ سیٹی اب کہاں سنی جائے گی! کیا میں نوید کو بھول چکا ہوں؟ اُس کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے میں وہی سیٹی بجاتا ہوں جسے سوائے میرے کوئی نہیں سنتا یا پھر تو یہ کی روح نے سنی ہوگی۔ میں جوابی سیٹی کا انتظار کرتا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ روحیں سیٹی نہیں بجاتیں۔ میرے اندر اچانک اُس کی یادوں کا دریا طغیانی پر آ گیا۔ میں بھی The Museum of Innocence پڑھ چکا تھا۔ کیا میں اپنا ایک عجائب گھر بناؤں گا؟ وہ پلنگ جس پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا ابھی تک کمرے میں تھا، صرف اُس کی سفید نواڑ ختم ہو چکی تھی۔ وہ کرسی بھی موجود تھی جس پر ہم نے اپنے لباس رکھے تھے۔ باورچی خانے میں سٹیل کے وہ برتن ابھی تک رکھے تھے جو ہم سے پہلے والے رہائشی جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ اُن برتنوں میں وہ رکابی بھی ہوگی جس میں اُس نے نیچے والی منزل کے کمرے کے کونے میں پڑی میز اور کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا، وہ کرسی اور میز کہاں ہوگی؟ وہ گلاس بھی وہیں ہوں گے جن میں اُس نے شربت اور سادہ پانی پیا تھا، وہ پیالہ اور پرچ بھی ڈھونڈنی ہوگی جس میں میں اُس کے لیے دودھ ہی لایا تھا! وہ چمچ بھی چمچوں کے ڈھیر میں ہوگا جس سے اُس نے بہاری بریانی کھائی تھی۔ ایسا تو نہیں کہ اُس نے بریانی انگلیوں سے کھائی ہو؟ کیا میری یادداشت اتنی کمزور تھی؟ میں اپنے بھائیوں میں سے کسی سے اِس کی تصدیق کرواؤں گا۔ چیاں والے بنگلے کے لان اور پاس سے بہتی نہر کی تصویریں دیواروں پر لگاؤں گا اور اگر بنگلہ ڈھے گیا ہو؟ سنگترے ختم کر کے کنوؤں کو وجود دے دیا گیا تھا مگر نوید کی یادیں میری بے بسی کے مردہ وجود میں اچانک زندہ ہو گئیں ہیں!!

ختم شد

گوجرانوالہ چھاؤنی

خالد فتح محمد کا خاندان ماڑی بوچیاں ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) سے ہجرت کر کے گوجرانوالہ کے ایک دور افتادہ گاؤں قلعہ جے سنگھ میں آباد ہوا۔ خالد فتح محمد 19 اپریل 1949ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اسی گاؤں میں حاصل کی۔ وہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں زیرِ تعلیم تھے کہ عساکرِ پاکستان میں ملازمت کے لیے منتخب ہو گئے۔ 1993ء میں ملازمت سے علیحدگی اختیار کر کے گوجرانوالہ چھاؤنی میں سکونت اختیار کی اور لکھنے لکھانے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے، دو طبع زاد ناول اور ناولوں کے چار تراجم چھپ چکے ہیں۔ ان کے افسانے، تجزیاتی مطالعے اور تنقیدی مضامین اردو کے موقر جراید میں چھپتے ہیں۔ وہ ایک ادبی پرچے ادراک کے مدیر ہیں جس کا شمار دنیا کے اہم رسائل میں ہوتا ہے۔

ISBN 978-969-652-097-9
Jumhoori Publications